ساجد خان کا افسانوی مجموعہ:

''دائرے کا اسیر'' فکری وفنی مطالعہ

(مقالہ برائے بی ایس اُردُو)

مقالہ نگار:

ذیشان عالم

نگرانِ کار:

پروفیسر دل نواز عارفؔ

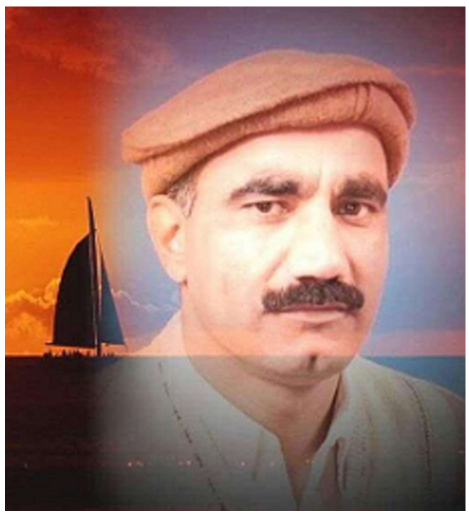
شعبۂ اُردُو

گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج نمبر ا ایبٹ آباد

ماتحت ایبٹ آباد یونی ورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی

سال ۲۰۲۱ء

بسم الله الرحمن الرحيم



ساجدخان

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ ذیشان عالم ولد حفیظ الرحمٰن رول نمبر ۱۲۔۱۷ نے بی ایس اُردُو کے تحقیقی مقالہ بعنوان ''ساجد خان کا افسانوی مجموعہ ''دائرے کا اسیر'' فکری و فنی مطالعہ'' میری نگرانی میں مکمل کیا۔

یہ مقالہ تحقیقی حوالے سے ایچ ای سی کے معیار کے مطابق ہے اور حصولِ سند کی خاطر اسے اگلے مراحل میں پیش کرنے کی سفارش کرتا ہوں۔

پروفیسر دل نواز عارفؔ
شعبۂ اُردُو
گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج نمبر ا ایبٹ آباد

فہرست عنوانات

تفصیلی ابواب بندی

حرفِ سپاس

سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں، جو تمام صفاتِ کاملہ، غفور رحیم اور مسبب الاسباب ہے۔ خاکسار اس کے حضور عاجزانہ شکر بجالاتا ہے اور اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل اور احسان نہ ہوتا تو مقالے کا یہ کٹھن اور سفر آزما سفر طے نہ کر پاتا۔ شکر الحمداللہ

گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج نمبر ا ایبٹ آباد کے شعبۂ اُردو کی سرپرستی اور رہنمائی میں جاری بی ایس اُردو پراگرام کی درسی اور جزوی تکمیل سے متعلق موضوعِ تحقیق ''ساجد خان کا افسانوی مجموعہ 'دائرے کا اسیر' فکری و فنی مطالعہ''، اس مجوزہ تحقیقی مقالے کا مقصود ہے۔ ہزارہ کی بہت سی علمی و ادبی شخصیات اور ان کی خدمات پر کام ہو چکا ہے لیکن بہت سی ایسی شخصیات ہیں جن پر تحقیقی کام ہونا باقی ہے سر زمین ہزارہ کے ادبی اُفق پر چمکتے ستاروں میں ایک نام ساجد خان کا بھی ہے، جو فنِ افسانہ نگاری کے حوالے سے ایک معتبر نام ہے۔ پس راقم نے ان کے افسانوی مجموعے ''دائرے کا اسیر'' فکر و فنی مطالعہ کو تحقیقی مقالے کے لیے بطورِ موضوع منتخب کیا۔ راقم نے اپنے اس مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے، جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

بابِ اوّل: ساجد خان کی سوانح حیات، پیدائش، تعلیم، ملازمت، شادی، اولاد، شخصیت، افسانہ نگاری کا آغاز وغیرہ پر بحث کی گئی ہے۔

بابِ دوم: اُردو افسانے کا آغاز و ارتقا: ایک جائزہ، جس میں افسانے کا آغاز، ابتدائی افسانہ نگار، ترقی پسند افسانہ نگار، رومانی افسانہ نگار، ہزارہ میں افسانے کی روایت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

بابِ سوم: افسانوی مجموعے ''دائرے کا اسیر'' فکری مطالعہ کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔

بابِ چہارم: میں افسانوی مجموعے ''دائرے کا اسیر'' کا فنی مطالعہ شامل ہے، جس میں زبان و بیان، کردار نگاری، کردار نگاری، منظر نگاری، فطرت نگاری وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے، جس سے اُن کا فن نکھر کر سامنے آتا ہے اور اُن کا مقام و مرتبہ متعین ہوتا ہے۔

بابِ پنجم: جو حاصلِ تحقیق ہے اس میں تحقیقی مقالے کا نچوڑ اور ممکنہ نتائج اور تجاویز پیش کی گئی ہیں۔

انسان جس قدر علم کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہوتا ہے اسے ایک سے ایک نایاب گوہر سے آشنائی ہوتی ہے۔ اس راہ میں نکلنا اور مجاہدہ کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی، کیوں کہ بعض مقامات اس قدر کٹھن در پیش ہوتے ہیں کہ آدمی جی ہار جاتا ہے۔ جن لوگوں نے جہدِ مسلسل کا دامن تھامے رکھا وہ کامیاب ہوئے اور نام کی زندگی جی رہے ہیں اِسی منزل کے متلاشی اور راستے کے مسافروں کی بھیڑ میں، میں بھی رواں ہوں تعلیمی سلسلے کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے

چار برس قبل بی ایس اُردُو میں ایک طالب علم کی حیثیت سے آیا اور آج اس سلسلے کو پایۂ تکمیل تک پہچانے کے بعد یہاں سے رخصتی پانے والا ہوں ۔ دورانِ مطالعہ علمی تحقیق کا ایک پُرمسرت مرحلہ بھی طے کیا تحقیقی مقالے کا عنوان تھا ''ساجد خان کا افسانوی مجموعہ ''دائرے کا اسیر'' فکری وفنی مطالعہ۔ اس موضوع کے انتخاب کا ذریعہ انتہائی نفیس انسان جناب قمرزمان صاحب بنے۔

مقالے کی تکمیل میں نگران کی اہمیت مسلمہ ہے۔ میں اس حوالے سے انتہائی خوش قسمت ہوں کہ محترم دل نواز عارفؔ صاحب جیسی علمی وادبی شخصیت نے میرے تحقیقی مقالے کا نگران بننا قبول کیا، جوخصوصی شکریے کے مستحق ہیں جنھوں نے نہ صرف راقم کو تحقیق کے کٹھن منازل کو طے کرنے کا ہنر سکھایا بل کہ اس مقالے کا بڑے ذوق وشوق سے مطالعہ فرما کر موضوع کے متعلق مفید مشوروں سے نوازا اور مقالے کی نوک پلک درست کرنے میں بڑی معاونت کی۔ یقیناً یہ مقالہ دل نواز عارفؔ صاحب کی خوش نظری کے بغیر راقم کے لیے ناممکن تھا انھوں نے راقم کی پوشیدہ صلاحیتوں کو اُجاگر کیا جس کی وجہ سے راقم ادب کی سنگلاخ چٹانوں پر سفر کرتے ہوئے اس تحقیقی موضوع پر کام کر سکا۔ راقم کے لفظوں میں اتنی جان کہاں کہ بھر پور طریقے سے پروفیسر دل نواز عارفؔ جیسی ہمہ جہت شخصیت کے شکریہ کے پہلو کو کوئی قالب پہنا سکے۔

میں ایسی ہستی کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں اور ان کے لیے دعا گو ہوں کہ اگر ان کی پُرخلوص دعائیں اور حوصلہ افزائی نہ ہوتی تو یہ مقالہ کبھی بھی تکمیل تک نہ پہنچ سکتا۔ راقم کی مُراد اپنے والدین سے ہے جن کی بے پناہ نیک خواہشات اور پُرخلوص دعاؤں نے راقم کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی ہمت عطا کی۔

تحقیقی موضوع کے انتخاب پر محترم قمرزمان صاحب کا نہایت مشکور ہوں، جنھوں نے ہر قدم پر حوصلہ افزائی کی اور جناب ساجد خان صاحب نے مواد فراہم کرنے اور قدم قدم پر رہنمائی کرنے کا فریضہ ادا کیا راقم ان کا تہہ دل سے شکر گزار ہے۔ احتشام بھائی نے راقم کو ''اِن پیج'' کا یہ فارمیٹ فراہم کیا جس کے ذریعے راقم نے آسانی سے اس مقالے کو تحریر کیا۔ اس راہِ پُرخار کو طے کرنے میں پروفیسر اظہر شاہ صاحب کی دعائیں اور نیک تمنائیں شامل ہیں راقم ان کا بھی تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہے، اِنھیں کی حوصلہ افزائی سے یہ مقالہ ممکن ہوا۔

مولانا اسحاق خان لائبریری ایبٹ آباد مادرِ علمی کی حیثیت سے راقم کے استفادے کے کام آئی اور گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج نمبر ا ایبٹ آباد کی لائبریری سے بھی بھر پور استفادہ کیا یہاں موجود لائبریرین جناب نوید بھائی مجھ پر خصوصی مہربان ہیں راقم ان کا بھی شکریہ ادا کرتا ہے۔

دوست احباب میں سے شاہ زیب عباسی، محسن علی، طلحہ، ثاقب حسین، حمزہ، فخر علی وہ ہستیاں ہیں جو راقم کی

کامیابی پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں راقم ان کی پُر خلوص محبت کا شکر یہ ادا کرتا ہے۔ راقم کے ہم مکتب دوستوں میں سے محمد اویس، نعمان نثار، ذوہیب، اویس علی، عمر رفیق، اعظم، ارمغان عباسی، وقار یونس، اور عدنان عباسی نے مطالعے کا بہترین ماحول فراہم کیا راقم ان کا بھی تہہ دل سے شکر یہ ادا کرتا ہے اور ساتھ ہی راقم اپنی ہم جماعت حلیمہ عباسی، فاریہ صابر، مصباح سلطان، شبینہ بدر کا بھی شکر یہ ادا کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ راقم کو اپنی نیک دعاؤں میں یاد رکھتی ہیں۔

اس مقالے کی تکمیل میں راقم اپنے دادا ابوفضل الرحمٰن کا تہہ دل سے شکر یہ ادا کرتا ہے کہ ان کی حوصلہ افزائی اور دعاؤں سے یہ تحقیقی کام مکمل ہوا۔ اپنے دوست شاہ زیب اور اپنے بھائیوں فرخ حفیظ، آفاق قدیر اور ارسلان نور کا بہت شکر گزار ہے جنھوں نے قدم قدم پر راقم کو سہارا دیا اور راقم کی ہر قسم کی مدد فرمائی۔ راقم کو گھریلو مسائل سے آزاد رکھا اور اطمینان سے کام کرنے کا موقع فراہم کیا۔

ذیشان عالم

بابِ اول:

ساجد خان: سوانحی خاکہ

خاندانی پسِ منظر:

ساجد خان کے آباؤ اجداد کا تعلق ہزارہ کے ذرخیز علاقہ ''کیالہ'' حویلیاں سے ہے، جو ایبٹ آباد کی تحصیل حویلیاں کا سرسبز علاقہ ہے ان کے آباؤ اجداد کی قبور اور زمینیں کیالہ میں ہیں جبکہ کچھ زمین دوسرے گاؤں میں بھی موجود تھیں۔ ان کے پردادا شاہزمان خان کیالوی ''کیالہ'' کی معروف شخصیت تھے، ان کے دادا میر محمد خان کیالوی حویلیاں کے نامور اور بڑے تجارتی افراد میں شامل تھے۔ موصوف کے آباؤ اجداد تجارت سے وابستہ تھے۔ کھیتی باڑی، ڈھور ڈنگر اور پھر کچھ عرصہ تک ٹرانسپورٹ کے کام سے بھی وابستہ رہے۔ انکے والد سخاوت خان کیالوی نے آباؤ اجداد کے کاروبار کو جاری رکھا۔ اس ضمن میں چیئرمین ہزارہ چیئر ہزارہ یونیورسٹی ریٹائرڈ پروفیسر بشیر احمد سوزؔ لکھتے ہیں:

> ''ساجد خان کے آباؤ اجداد ہزارہ کے جنت نظیر علاقے ''کیالہ'' سے تھے جو عرصۂ دراز سے حویلیاں میں رہائش پذیر ہیں۔''[۱]

اسی سلسلے میں ان کے بچپن کے دوست ہم جماعت معلم تنویر الٰہی کا کہنا ہے:

> ''آپ کے آباؤ اجداد قیامِ پاکستان سے قبل (کیالہ سے) حویلیاں شہر میں کاروبار کی غرض سے آئے پھر یہیں مقیم ہو گئے۔''[۲]

خود ساجد خان کا مزاج قلم اور قرطاس سے جڑا ہوا ہے۔ وہ درس اور تدریس سے وابستہ ہیں اور عرصۂ دراز سے لکھنے، لکھانے اور ادب کی خدمت میں مصروف ہیں یعنی تدریس و تخلیق کا عمل شانہ بشانہ چل رہا ہے وہ پیشے کے لحاظ سے معلم اور ذوق کے لحاظ سے ادیب ہیں۔ ان کے قریبی جاننے والے معلم غلام مرتضٰی حویلیاں گاؤں کا کہنا ہے:

> ''ساجد خان صاحب ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جو ایک باشعور اور پڑھا لکھا خاندان ہے جو نسل در نسل سیاسی شعور سے بہرہ ور چلا آ رہا ہے۔''[۳]

پیدائش:

ساجد خان کی پیدائش محلّہ ''ٹینکی''، موجودہ نام محلّہ ''فاروق اعظم'' حویلیاں میں ہوئی۔ سرکاری دستاویزات

کے مطابق ان کی تاریخِ پیدائش ۱۵ِ مارچ ۱۹۷۲ء ہے، جب کہ اصل تاریخِ پیدائش ۵ِ مارچ ۱۹۷۱ء ہے۔ اس تفاوت کی وجہ یہ ہے کہ آج کی طرح اس وقت بھی بعض والدین اور اساتذہ بچوں کی عمر عموماً لکھوایا کم کرتے تھے۔

بچپن:

ان کو بچپن میں ان کی بڑی پھوپھی مبارک جان مرحومہ نے ہی پالا تھا، خاندان مشترک رہتا تھا مگر ان کے دادا جان میر محمد خان کیالوی کی موجودگی میں تمام اختیارات ان کی بڑی پھوپھی کے ہاتھ میں تھے۔ اور وہ اپنے بھتیجے سے بے حد محبت کرتی تھیں موصوف بھی سب سے زیادہ محبت اپنی پھوپھی سے ہی کرتے تھے اور وہی ان کا سب کچھ تھیں چونکہ ان کی پھوپھی کی کوئی اولاد نہیں تھی اس لیے انھوں نے ساجد خان کو ہی اپنا بیٹا بنالیا تھا اور اپنی مادرانہ شفقت و ممتا ساری کی ساری اپنے ہونہار بھتیجے پر لٹادی جس کی انھوں نے بھی خوب لاج رکھی اور اپنی مرحومہ پھوپھی کے ساتھ وفاداری اور محبت کی لازوال داستان رقم کی۔ انہوں نے اپنے سب سے پہلے افسانوی مجموعہ کو اپنی پھوپھی مرحوم ہی سے منسوب کیا ہے، اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

> ''اپنی بہت ہی پیاری پھپھو مرحومہ و مغفورہ مبارک جان کے نام جنھوں نے میری راہوں کے کانٹے اپنی پلکوں سے چُنے۔''۴

ان کی والدہ آمنہ بیگم بھی ان سے بے حد پیار کرتی تھیں سارا خاندان ایک ساتھ رہتا تھا مگر ساجد خان اپنی مرحومہ پھوپھی مبارک جان سے حد درجہ پیار کرتے تھے۔ ان کے محلے دار دوست نعیم عرف پپو کا کہنا ہے:

> ''ساجد خان کا بچپن زیادہ تر پھپھو کے پاس گزرا ہے ان کی پھپھو نے ان کو گود لیا ہوا تھا اور وہیں ان کے پاس رہتے تھے، جس وجہ سے وہ اپنی پھپھو کو والدہ سے زیادہ عزیز تھے''۵

اسی لیے کہا جاتا ہے ''Love Begets Love'' کہ انسانی روّیے، اخلاص اور خلوص ہر شے کو اپنے حصار میں لے لیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ساجد خان اپنی محبت کا دم بھرتا ہے۔ اور تا دم تحریر اُن کی محبت کے حصار سے نکل نہیں سکے۔ پھپھو کی محبت نے اُن کی شخصیت کو مضبوط کر کے اعتماد کی دولت بخشی۔

تعلیم وتربیت:

ساجد خان نے ابتدائی تعلیم کا آغاز جناح پبلک سکول حویلیاں سے کیا، میٹرک گورنمنٹ ہائی سکول نمبر ا حویلیاں سے کی۔ ۱۹۹۶ء میں گورنمنٹ ڈگری کالج حویلیاں سے گریجویشن مکمل کی اور ۱۹۹۹ء میں پشاور یونی ورسٹی سے ایم اے اسلامیات کی سند لی، ملازمت کے دوران ۲۰۰۰ء میں علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اسلام آباد سے انھوں نے بی ایڈ کی ڈگری حاصل کی اور ۲۰۰۵ء میں ہزارہ یونی ورسٹی مانسہرہ سے ایم اے اُردُو کی سند لی۔

ملازمت:

ساجد خان نے ۱۹۹۶ء میں مدرس کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا۔ اس وقت انھوں نے ہزارہ ڈویژن میں مجموعی طور پر تیسری پوزیشن لی اور بطورِ معلّم تعینات ہوئے۔ اِس وقت بھی گورنمنٹ ماڈل ہائی سکول حویلیاں میں درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔

ازدواجی زندگی اور اولاد:

ساجد خان نے تین شادیاں کی ہیں۔ پہلی شادی ۱۱ نومبر ۱۹۹۸ء کو ارجمند بی بی سے ہوئی۔ پہلی شادی سے ان کی دو بیٹیاں مریم نور اور سلمٰی نور ہیں جو ابھی زیرِ تعلیم ہیں۔ موصوف اپنی بیٹیوں سے بے حد پیار کرتے ہیں۔ ان کے متعلق اپنے پہلے افسانوی مجموعہ میں لکھتے ہیں:

''جو میری زِیست کا حاصل ہیں
وہ میرے خون میں شامل ہیں
وہ میرے دِل کی دھڑکن ہیں
وہ دونوں رونقِ گلشن ہیں
وہ دونوں مجھ سے ہوں نہ دُور
اِک مریم نور اِک سلمٰی نور'' [۶]

دوسری شادی ۳ مارچ ۲۰۱۱ء کو گل بی بی سے ہوئی، جس سے ان کا ایک بیٹا عثمان خان ہے جو ابھی زیرِ تعلیم

ہے۔اور تیسری شادی ٦ نومبر ۲۰۱۵ء کو شازیہ سے ہوئی لیکن اسے ٦ نومبر ۲۰۱٦ء کو ان سے علیحدگی کر لی۔

شخصیت و کردار:

وہ صاف وشفاف شخصیت کے مالک ہیں۔ان کی شخصیت کے بارے میں شاعر خداداد خالد لکھتے ہیں:

''ساجد خان کی شخصیت آئینے کی طرح شفاف اور واضح ہے''۔ ۷

ان کی ظاہری شکل وصورت اور قد وقامت عام انسانوں کی طرح ہے معاشرے میں موجود ہزاروں انسانوں کی طرح درمیانہ قد اور عام سی شکل وصورت ہے لیکن موصوف طبیعت کے لحاظ سے انتہائی شفیق،نرم مزاج اور قبولِ عام وخاص افراد کی فہرست میں شامل ہیں جو خداداد صلاحیتوں کے مالک ہیں وہ خوش مزاج اور کھلی ڈُھلی شخصیت رکھتے ہیں ان کی شخصیت کی تصویر اُن کے دوستوں کے بیان سے واضح ہوتی ہے۔ان کے ہم پیشہ ملک شاہد اعوان کا کہنا ہے:

''ساجد خان اپنے کام میں بہت ہی زیادہ مخلص ہیں کوئی بھی کام دکھاوے کے لیے نہیں کرتے،چھوٹے بڑوں کے ساتھ ان کا روّیہ بہت اچھا ہے انتہائی نرم دل ہیں اور ہمیشہ مثبت چیزوں کو اُجاگر کرتے ہیں منفی پہلو کسی کا نہیں دیکھتے جو بات بھی کہنی ہو منہ پر کہہ دیتے ہیں۔دل میں کوئی بات بھی نہیں رکھتے۔'' ۸

ساجد خان دوستوں کا دوست ہے اور یاروں کا یار ہے وہ کھلے ذہن سے تجزیہ کرتا ہے وہ اپنے تجربات بھی اپنے دوستوں سے شیئر کرتا ہے۔تاکہ وہ غلطیاں جو ان کی شخصیت کا حصہ بنی ہیں وہ کسی اور کی شخصیت کا حصہ نہ بنیں۔ان کے دوست مفتی حفیظ الرحمٰن طاہر کا کہنا ہے:

''ساجد خان ایک اچھے معلّم ہیں جو انتہائی باذوق اور دلچسپ طبیعت کے مالک ہیں ہر وقت نئی چیزوں کو سمجھنے،سمجھانے اور سکھانے میں مصروف رہتے ہیں کوئی بھی نیا عنوان ان کے سامنے زیرِ بحث لایا جاتا ہے تو وہ اس پر خوشی محسوس کرتے ہیں اور اگر کسی غلطی پر متنبہ کیا جائے تو اسے بھی تسلیم کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔'' ۹

ان کی معاشرے کے اندر لوگوں کے ساتھ اچھے تعلقات ہیں ہر کسی کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آتے ہیں۔اس کے ساتھ وہ لوگوں کے درد کو اپنے اوپر طاری کر لیتے ہیں کیونکہ بہت حساس طبیعت کے مالک ہیں اس کی سب سے بڑی وجہ ہمدردی ہے۔نفسیاتی طور پر حد درجہ حساس شخصیت ہیں یہی حساسیت اُنھیں اس ظالم معاشرے میں غصیلا کر دیتی ہے وہ خود کو اور معاشرے کو گالی دیتے ہوئے ہر گز نہیں کتراتے ان کا غصہ اُن کے اندر کی حساسیت کو سامنے لاتا ہے وہ کڑھتا ہے اور صبر کی آخری حدوں کو چھونے کے بعد ننگی غلیظ گالیوں پر اُتر آتے ہیں۔معاشرہ کے پس منظر کے بجائے پیش منظر کو دیکھنا اُسے جذباتی اور غصیلا کر دیتا ہے اور وہ حقِ سچائی ادا کر دیتے ہیں۔اور خود اپنی ذات پر سچ بولنے سے بھی پیچھے نہیں ہٹتے وہ اپنی گالیوں کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی غلطیاں تسلیم کرتے ہیں اور وہ خود کو بھی کٹہرے میں کھڑا کرنے سے نہیں ہچکچاتے۔ان کے ایک دوست **معلم غلام مرتضیٰ** کا کہنا ہے:

> ''میں نے ساجد خان صاحب کو ایک سچا، مخلص، عزت دار اور بے ضرر انسان پایا ہے لیکن لوگوں کے روّیوں نے ان کو اُلجھا کے رکھ دیا ہے جس کی وجہ سے ان کی برداشت کم ہوگئی ہے اب وہ کبھی کبھی بدمزاج اور ترش مزاج بھی ہو جاتے ہیں مگر وہ گوشت پوست کے انسان ہیں کوئی پتھر تو نہیں ان کی حساسیت عام افراد سے بہت زیادہ ہے، جو ان کو معاشرتی بے انصافیوں پر غصیلا بھی کر دیتی ہے۔''[۱۰]

جیسا کہ گذشتہ اوراق میں بیان ہو چکا ہے ساجد خان کے دادا میر محمد خان حویلیاں کے ایک معروف شخصیت تھے۔ان کو اپنے بیٹے سخاوت خان سے بے حد محبت تھی سخاوت خان کی پہلی اولاد ساجد خان ہوئے تو سب کے لاڈلے ٹھہرے مگر کسی نے خوب ہی کہا تھا کہ لاڈلے افراد کو ہی دنیا میں دھکے لگتے ہیں۔سب سے زیادہ مسائل کا سامنا لاڈلے افراد کو ہی کرنا پڑتا ہے ایسا ہی ان سے بھی ہوا۔میر محمد خان بڑی زمین جائیداد کے مالک تھے۔اُن کو اپنے پوتے ساجد خان سے بے حد لگاؤ تھا اور اُن کی یہ خواہش زبان زدِ عام بھی تھی کہ ''مجھے موت تب آئے جب میرا پوتا ساجد خان سولہ ۱۶ برس کا ہو جائے''۔مگر ان کی یہ خواہش تو پوری نہ ہو سکی ساجد خان ابھی دس ۱۰ برس ہی کے تھے ان کے دادا دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ان کو زندگی کا ایک ایک پل محبتوں اور چاہتوں سے بھرپور ملا اور اس لاڈ پیار میں وہ نصف صدی کے قریب پہنچ آئے ہیں ان کی چالیس ۴۰ برس کی زندگی ایک بھرپور زندگی تھی ایسی زندگی کی شاید ہر کوئی جس کی تمنا کرے، جس میں غم اور تفکرات نہ تھے، مسئلہ تب بنا جب پیار محبت کرنے والے دنیا سے کوچ کر گئے۔مسائل نے ان کو اپنے جال میں جکڑ لیا اور زندگی کا دوسرا رُخ سامنے آیا جس میں تلخیاں ہیں، ناآسودگی اور غم روزگار رہے یہی وجہ ہے کہ

ساجد خان اپنی زندگی سے بیزار دکھائی دیتا ہے یہی بیزاری اُن کی تحریروں میں جا بجا نمایاں ہوتی ہے اُنھیں پیسے کی کوئی قدر نہیں اور نہ ہی دولت کا اسیر ہے۔ بقول اقبالؒ:

''ساماں کی محبت میں مُضمَر ہے تن آسانی
مقصد ہے اگر منزل، غارت گرِ ساماں ہو''[11]

ساجد خان آزاد منش شخص ہے وہ کسی فرد کا بھی ذہنی، روحانی اور جسمانی غلام نہیں وہ اپنی راہیں خود تلاش کرتا ہے اور اپنا ہر کام خود کرنا جانتا ہے وہ سیلف میڈ شخص ہے اور وہ اندھا اعتماد کرنے والا فرد ہے۔ اس ضمن میں افسانہ نویس اور شاعر محمد بشیر رانجھا رلکھتے ہیں:

''آزادی ساجد خان کے وجود کا سب سے بڑا مسئلہ ہے اور اُس کا کہنا ہے کہ آزادی
سرمائے سے سلب ہوتی ہے اور اس کے ذریعے انسانوں کی خرید وفروخت ہوتی ہے
لیکن اُس کے پاس کوئی سرمایہ نہیں ہے اس لیے وہ آزاد ہے۔''[12]

ساجد خان اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ادبی دنیا میں اعلیٰ مقام کے حامل ہیں اور معاشرے اور ادبی دنیا میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ جس میں اُن کے خاندان بالخصوص ان کی پھپھیوں، والدین اور ان کی اپنی محنت کار فرما ہے وہ خودداری اور خودگری کے ساتھ جینے کے سلیقے سے آگاہ ہیں اور اسی طور پر اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

سماجی سرگرمیاں:

ساجد خان تقریباً بائیس ۲۲ برس سے سماجی تنظیم انجمن فلاح و بہبود محلّہ ''ٹینکی'' موجودہ نام ''محلّہ فاروق اعظم'' حویلیاں کے بلا مقابلہ جنرل سیکرٹری ہیں اور ایک سماجی کارکن کے طور پر کام میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کے دوست ملک عرفان حویلیاں گاؤں کا کہنا ہے:

''ساجد خان اس کمیٹی کو کالج کے دور سے چلا رہے ہیں اگر محلّے یا کمیٹی کے افراد میں

> کوئی غمی خوشی ہوتی ہے تو سارے کا سارا انظام ساجد خان اور انکے دوستوں کے پاس ہی ہوتا ہے اور لوگوں کو ان پر پورا یقین ہے کیونکہ وہ اپنا کام پوری ایمانداری سے کرتے ہیں۔''[۱۳]

ساجد خان ایک سماجی ورکر ہیں، ہر ایک کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آتے ہیں اور ہر آدمی کے دُکھ کو اپنا دُکھ سمجھتے ہیں اسی لئے انھوں نے معاشرے میں نیک نام کمایا ہے۔اسی ضمن میں ان کے دوست اور محلّہ دار محمد زاہد قریشی کا کہنا ہے:

> ''تعلیمی اور تحریری سلسلہ کے علاوہ ایک اچھے سماجی ورکر بھی ہیں۔ محلے اور علاقے بھر میں عوام کے ساتھ خوشی اور غمی کے تمام واقعات پر مقدم نظر آتے ہیں اور ہر آدمی کے دُکھ درد میں بھرپور شریک ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے عوام الناس بھی ان کی شخصیت سے والہانہ محبت کا اظہار کرتے ہیں۔اس کے علاوہ اُردُو ادب کی ترویج کے لیے مختلف محاذوں پر سرگرمِ عمل رہتے ہیں۔''[۱۴]

ساجد خان دیگر سماجی بہبود کی سرگرمیوں کے ساتھ وابستہ ہیں،جن میں سے چند ایک کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

۱۔فرض سٹیزن کمیونٹی بورڈ حویلیاں کے جنرل سیکرٹری
۲۔علامہ مشرقی فاؤنڈیشن ایبٹ آباد کے جنرل سیکرٹری
۳۔ادبی تنظیم حرف اکادمی ہزارہ کے سابق کوآرڈینیٹر
۴۔کاوش فاؤنڈیشن ایبٹ آباد کے ایگزیکٹو ممبر

اُن کے سماجی کام کو سہراتے ہوئے ڈاکٹر پروفیسر عادل سعید قریشی رقمطراز ہیں:

> ''ساجد خان ایک سوشل ایکٹیوسٹ بھی ہے شروع ہی سے ان کے اندر معاشرے کا خدمت گار بننے اور ایک سماجی کارکن بننے کا شوق کہیں یا لگن موجود تھی۔اس حوالے سے اس نیک نام کمایا ہے۔اپنے گاؤں اور شہر میں اس کو ایک ہمدرد سماجی کارکن کے طور پر جانا جاتا ہے، جس نے ایک بڑے معاشرے کا خواب ہی نہیں دیکھا بلکہ اس کے لیے کوشش بھی کی ہے اور آج بھی ان سماجی سرگرمیوں میں اپنے تخلیقی کاموں کا وقت خرچ

کر رہا ہے اور وہ وقت کے اس مصرف کو اپنے وقت کی بہترین انویسمنٹ جانتا ہے۔''۱۵؎

ادبی سرگرمیاں:

ساجد خان شروع سے ہی ادبی سرگرمیوں میں مشغول رہے وہ حویلیاں کی ادبی تنظیم قلم کارواں سے وابستہ رہے اور بعد ازاں اُنھوں نے حرف اکادمی ہزارہ کی بنیاد اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر رکھی، جو ادب کو فروغ دینے میں کلیدی کردار ادا کر رہی ہے۔ یہ تنظیم پورے پاکستان میں موجود ہے ہزارہ میں اس تنظیم کی شاخ کی ابتدا ساجد خان، جعفر محمود ہاشمی، پروفیسر خورشید احمد عون، پروفیسر فرحان انجم، اور محسن چوہان نے رکھی تھی، جو اب پھیل کر پچیس ۱۲۵ افراد تک جا پہنچی ہے۔ وہ ہزارہ کی اس تنظیم کے کوارڈینیٹر بھی رہے ہیں۔ ان کا رجحان ادب کی طرف زیادہ تھا۔ گورنمنٹ ماڈل ہائی سکول حویلیاں کے سینئر معلم عبدالرحمٰن جاوید کہتے ہیں۔

> ''ساجد خان کو سکول میں بھی لائبریری سے بچوں کو مانوس کرنے کا کام تفویض کیا گیا تھا اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ ساجد خان نے حویلیاں میں پہلی لائبریری زرناب صفی کے نام سے اپنی مدد آپ کے تحت بنائی تھی۔ ۲۰۰۰ء میں اس لائبریری کا افتتاح حویلیاں شہر کے ناظم ملک حبیب الرحمٰن نے کیا تھا جس کی دعا جامع مسجد کے خطیب مولانا منظور احمد نے کروائی تھی یہ حویلیاں کی پہلی لائبریری تھی اس پروگرام میں معروف سیاسی شخصیات نے شرکت کی تھی جن میں معروف سیاسی شخصیت افتخار احمد خان، احمد نواز خان، ملک شکیل احمد شامل تھے جبکہ حویلیاں سے سماجی اور عام عوام نے بھر پور شرکت کی تھی ساجد خان کے پھپھی زاد بھائی اور بہنوئی حق نواز خان کوئٹہ بھی اس پروگرام میں شامل تھے۔''۱۶؎

ساجد خان ادبی سرگرمیوں سے بچوں کی حوصلہ افزائی کے علاوہ ہم نصابی سرگرمیوں: تقاریر، مضامین وغیرہ کے ذریعے ان کے اندر تخلیقی جواہر کو نکھارنے کا فریضہ بھی انجام دے رہے ہیں علاوہ ازیں اوّل آنے والے بچوں کو انعامات دینے اور مختلف ادبی محافل منعقد کرواتے رہتے ہیں اس کے علاوہ شعور آگہی پیدا کرنے اور مسائل کو اجاگر کر کے ان کے حل کی تلاش میں جتے رہتے ہیں۔ ان کے ادبی ذوق کے حوالے سے محمد بشیر رانجھا لکھتے ہیں:

> ''ساجد خان چونکہ افسانہ نویس ہونے کے ساتھ ساتھ اچھا شعری ذوق بھی رکھتا ہے اور

اس ذوق کی تسکین کے لیے وہ اکثر شعرا کی محافل میں نظر آتا ہے۔یُوں اُس کی تحریروں میں ''قلم کارواں حویلیاں'' کے شعرا کی دوستی اور اُن کے ساتھ نشست و برخاست کے اثرات بھی نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔''۱۷

آغازِ افسانہ نگاری:

ساجد خان کو بچپن ہی سے لکھنے پڑھنے کا شوق تھا اور وہ سکول، کالج کے زمانے سے مضامین لکھتے رہے ہیں۔ اس ضمن میں ان کے دوست تنویر الٰہی کہتے ہیں:

''ساجد خان شروع ہی سے مطالعہ کرتے رہتے تھے ان کا ادبی رجحان الطاف نیوز ایجنسی سے پیدا ہوا کیونکہ وہاں کوئی لائبریری موجود نہ تھی ہمارا دوست خورشید احمد ریٹائرڈ معلم شام کے وقت الطاف نیوز ایجنسی پہ بیٹھتا تھا ہم شام کو وہاں جاتے اور کچھ نہ کچھ پڑھنے لگ جاتے تھے وہیں سے ساجد خان کو لکھنے کا شوق بھی پیدا ہوا کیونکہ ہماری اکثر ملاقات وہاں ہی ہوا کرتی تھی ہم گھنٹوں وہاں پڑھا کرتے تھے۔''۱۸

۱۹۹۶ء میں اُنھوں نے سفرِ کالم نویسی کی ابتدا کی۔انھیں لکھنے کا شروع سے ہی شوق تھا اور اس شوق نے کالم نویسی میں بھی اُن کی معاونت کی۔ کیوں کہ صاحبِ مطالعہ شخص ہی ایک اچھا لکھاری ہوسکتا ہے۔اسی سلسلے میں راشد خان جدون گاؤں لنگرہ کہتے ہیں:

''ساجد خان سے میرا تعلق سکول کے زمانے سے ہے۔بچپن سے ایک ہی شہر، ایک ہی سکول اور ایک ہی کالج میں ہونے کی وجہ سے ساجد خان کی شخصیت کے بہت سے پہلوؤں سے مجھے واقفیت ہے عرصہ دراز سے ساجد خان مختلف اخبارات ، رسائل اور ادبی محفلوں میں اپنے مضامین اور تحریروں سے لکھنے لکھانے کے شوق کی تکمیل میں کوشاں ہے۔''۱۹

افسانہ نگاری سے قبل ساجد خان مختلف اخبارات میں کالم لکھتے رہے، جن میں شمال، شملہ، صُبح، ندائے ہزارہ ،سرحد نیوز وغیرہ شامل ہیں۔ان کے کم وبیش اڑھائی سو کالم اخبارات کی زینت بنے اور ساتھ ہی ساتھ تعلیمی وسماجی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ان کا زیادہ تر رجحان تدریس اور علم و ادب کی طرف تھا چنانچہ انھوں نے

اخبارات میں کالم نویسی کے بعد افسانہ نگاری بھی شروع کر دی اور درجنوں افسانے لکھے ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''مجھے روشنی چاہیے'' کے نام سے ۲۰۱۱ء منظرِ عام پر آیا۔اس افسانوی مجموعہ کے بعد ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''دائرے کا اسیر'' ۲۰۱۴ء میں شائع ہوا جو کئی خوبیوں پر مشتمل افسانوی مجموعہ ہے۔ان کے افسانوں پر مختلف لکھاریوں نے آرا دیں اور مضامین بھی لکھے،جن میں مرحوم منشا یاد،مرحوم احمد جاوید،ڈاکٹر کاشف شاہد بٹ،ڈاکٹر روشن آرا راؤ،محمد اسفر آفاقی، اجمل نذیر، پروفیسر بشیر احمد سوزؔ، پروفیسر عادل سعید قریشی،سیّد ماجد شاہ، جانِ عالم، پروفیسر خورشید احمد عون اور پروفیسر فرحان انجم وغیرہ شامل ہیں ۔ان کی افسانہ نگاری کے بارے میں ان کے ایلیمنٹر ی کالج فیلو ملک عرفان حویلیاں گاؤں کا کہنا ہے:

> ''ساجد خان بطورِ کالم نویس ایلیمنٹر ی کالج ایبٹ اباد سے سامنے آئے تھے ۱۹۹۴ء سے بطورِ کالم نویس اخبارات میں لکھتے رہے وہ کالج کے چیف پراکٹر اور انچارج بزم ادب تھے پھر ان کے دوست انھیں ادب کی جانب لے آئے ۔ان کی پہلی افسانوی کتاب ''مجھے روشنی چاہیے''تھی جب کہ دوسری ''دائرے کا اسیر'' مگر ان کے مزید افسانے بھی ہیں جو کتابی صورت میں نہیں آئے۔''[۲۰]

ان کے افسانے پاکستان کیساتھ ساتھ بین الاقوامی ادبی رسائل مثلاً ادبِ لطیف،شعروسخن ٹورینٹو،افسانہ فورم بھارت پٹنہ،شعروسخن مانسہرہ، کہکشاں راولپنڈی،ادب دوست انڈیا کیساتھ ساتھ اخبارِ ''جنگ'' نے افسانہ ''مجھے روشنی چاہیے'' فادرڈے(Father Day)پر بطورِ خراجِ تحسین رنگین صفحہ پر لگایا روزنامہ کے ٹو ٹائمز نے اپنی پہلی اشاعت پہ انکا انٹرویو شائع کیا اور ہزاروں کی تعداد میں اخبارات تقسیم کیئے ان کے افسانوں نے ملک بھر کے اہلِ قلم کی بھرپور توجہ حاصل کی ہے اور ان سے دادِ تحسین سمیٹی ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے مختلف کتابوں پر رائے بھی دی اور ہزارہ کے تقریباً تمام لکھاریوں کی کتابوں پر تاثراتی اور تنقیدی مضامین قلم بند کیے ہیں۔اس ضمن میں بشیر احمد سوزؔ لکھتے ہیں:

> ''ساجد خان کا رواں قلم ابھی رُکا نہیں اور ان کے افسانے اور دیگر تخلیقات پاکستان کے اہم علمی وادبی رسائل میں شائع ہو رہے ہیں۔''[۲۱]

تصانیف کا تعارف:

ساجد خان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''مجھے روشنی چاہیے'' کے عنوان سے اپریل ۲۰۱۱ء میں شائع ہوا جس کی اشاعت فرینڈز پبلشرز راولپنڈی سے ہوئی اس افسانوی مجموعہ کا انتساب ان کی پھوپھی مرحومہ مغفورہ مبارک جان اور دو بیٹیوں مریم نور اور سلمٰی نور کے نام ہے، جو ۱۴۴ صفحات پر مشتمل افسانوی مجموعہ ہے، جس میں کل چوبیس افسانے موجود ہیں نمبر شمار تو ۲۳ افسانوں کی گئی ہے لیکن ساجد خان نے اس مجموعہ کا جو دیباچہ لکھا ہے وہ بھی دراصل ایک افسانہ ہے انھوں نے منفرد انداز میں دیباچہ لکھ کر ایک نئی روایت کی بنیاد بھی ڈالی ہے۔ اس لیے اس کتاب میں انکے افسانوں کی تعداد چوبیس ۲۴ ہے۔ افسانوی مجموعہ میں درج ذیل افسانے شامل ہیں:

۱۔ جواز

۲۔ آخری اُڑان

۳۔ آکاش

۴۔ سومی

۵۔ اثاثہ

۶۔ اُس پار

۷۔ انقلاب

۸۔ بیٹی

۹۔ پاگل

۱۰۔ پانچ کا پینتالیس

۱۱۔ کتے

۱۲۔ جب اُن کا جی چاہے گا

۱۳۔ چھوٹا

۱۴۔ خدمتِ خلق

۱۵۔ خون

۱۶۔ زیست کا قرض

۱۷۔ سبکدوش

۱۸۔ گھروندا

ساجد خان کی کتاب ''مجھے روشنی چاہیے'' پر اردو اور فارسی کے معروف شاعر پروفیسر محمد زمان مضطر کا منظوم اظہار خیال:

''ہر سمت اندھیرا ہے مجھے روشنی چاہیے
بے نُور سویرا ہے مجھے روشنی چاہیے
تا دُور شبِ تار بلا چھائی ہوئی ہے
تا حدِ نظر کالی گھٹا چھائی ہوئی ہے
اب ہاتھ کو بھی ہاتھ سجائی نہیں دیتا
آنکھوں میں بھی اِک دُھند سی لہرائی ہوئی
ہر سمت اندھیرا ہے مجھے روشنی چاہیے
بے نُور سویرا ہے مجھے روشنی چاہیے

کرنوں سے نہ ہو جسکی زمانے میں اُجالا
اُس مہرِ دَرخشاں کی ضرورت نہیں مجھ کو
چمکائے نہ آنگن کو مرے چاندنی جس کی
ایسے مہِ تاباں کی ضرورت نہیں مجھ کو
ہر سمت اندھیرا ہے مجھے روشنی چاہیے
بے نُور سویرا ہے مجھے روشنی چاہیے

پُر ہول ، سیہ رات ہے ہو سُو ہی خدایا!
اب حامی و ناصر ہے مرا تُو ہی خدایا!

یہ انجم و مہتاب تو بے نُور پڑے ہیں
اَب بھیج دے میرے لیے جگنو ہی خدایا!
ہر سمت اندھیرا ہے مجھے روشنی چاہیے
بے نُور سویرا ہے مجھے روشنی چاہیے

ہر شخص سمندر کا ہے ایک ایک جزیرہ
ہر شخص ہے اس بحر حیاتی کا فسانہ
لے آیا ہے ساجدؔ بھی کچھ ایسے فسانے
رکھے گا جنہیں دیر تلک یاد زمانہ
کہتا ہے فسانوں میں وہ محبوب سے اپنے
پردہ رُخِ روشن سے ذرا تم ہی اٹھانا
ہر سمت اندھیرا ہے مجھے روشنی چاہیے
بے نُور سویرا ہے مجھے روشنی چاہیے''۲۲؎

ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''دائرے کا اسیر'' کے عنوان سے ۱۸ رمضان المبارک ۲۰۱۴ء میں شائع ہوا، جس کی اشاعت سلطان پبلشرز راولپنڈی سے ہوئی۔ اس افسانوی مجموعہ کا انتساب ان کی والدہ محترمہ اور لاڈلی بیٹیوں کے نام ہے جو ۱۲۸ صفحات پر مشتمل افسانوی مجموعہ ہے، جس میں کل پندرہ ۱۵ افسانے موجود ہیں اس افسانوی مجموعہ میں درج ذیل افسانے موجود ہیں۔

۱۔ بے بسی، بے چارگی، درماندگی
۲۔ مکافاتِ عمل
۳۔ دائرے کا اسیر
۴۔ کل مونہی
۵۔ تعاقب
۶۔ زمین سکڑ رہی ہے
۷۔ سراغ
۸۔ نئی کہانی

۹۔کتمان

۱۰۔وی

۱۱۔دردِمشترک

۱۲۔خلش

۱۳۔غلاظت

۱۴۔دائروں میں بٹی زندگی

۱۵۔ ۔مردہ خانہ

ساجد خان کی کتاب ''دائرے کا اسیر'' پر نوجوان شاعر بدر منیر کا منظوم اظہار خیال:

''یہ بعد قرأتِ مجموعہ ''دائرے کا اسیر''
گرفتِ حرف و حکایت کی پائی ہے تاثیر

نصیب سب کو کہاں انفرادیت ایسی
کہ نفسیات سے لینا سماج کی تصویر

جگہ جگہ پہ ہیں حضرت بہ درسِ صوتِ بلند
خلوص و مہر و وفا و نکوئی کی تدبیر

فسانہ پیش ِعمل ندرت و تنّوع میں ہے
فنِ نظارہ کشی دل کشیدن و دلگیر

خمار گیں بشریت کا فرض بیداری
ادا ہی کرتا ہے اکثر مصنفِ شبگیر

ہے ''روشنی کا سفر'' میں قلم کا قرض ادا
ادب کو سونپ چکے ہیں یہ پہلے بھی تنویر

سند رہے یہ عقیدت قلم کے رشتے میں
بنامِ خان رقم کردہ بدر کی تحریر'' ۲۳؎

اعزازات:

مختلف تنظیموں نے اُنھیں اِن افسانوں پر اعزات سے نوازا:

☆ صدائے پھلگراں (مجھے روشنی چاہیے)

☆ حویلیاں پریس کلب (مجھے روشنی چاہیے)

☆ پریس کلب کلر کہار برائے ادبی خدمات (دائرے کا اسیر)

☆ سادات ایکٹو سیٹیزن کمیونٹی (دائرے کا اسیر)

☆ حویلیاں پریس کلب ایوارڈ برائے افسانوی مجموعہ (دائرے کا اسیر)

☆ علامہ مشرقی ایوارڈ برائے حسن کارکردگی ادبی خدمات

☆ ایبٹ اباد پہلا اسلام ٹیچر ایوارڈ بدست ڈپٹی کمشنر ایبٹ اباد

☆ بیسٹ ٹیچر ایوارڈ بدست میجر جنرل رضا محمد یونس

☆ بیسٹ ٹیچر ایوارڈ بدست مشیر وزیر اعلیٰ خیبر پختونخوا

☆ بیسٹ ٹیچر ایوارڈ بدست ڈی ای او ایبٹ اباد

☆ بیسٹ ڈیبیٹر سرٹیفکٹ گورنمنٹ ایلیمنٹری کالج ایبٹ اباد

☆ اے اینڈ ایس ہیلتھ ارگنائزیشن ایبٹ اباد ٹیلنٹ سپر ہیرو ایوارڈ گولڈ میڈل

نظریۂ ادب:

ادب اور زندگی کا چولی دامن کا تعلق ہے۔ ادب کا موضوع زندگی ہے یہ موضوعات زندگی ہی سے لیتا ہے۔ ادب زندگی کا عکاس، نقاد اور ترجمان ہوتا ہے اگر زندگی ہے تو ادب کی پہچان اور اس کا احساس ممکن ہے جو کسی بھی شاعر یا ادیب کی اجتماعی شعور کا حصہ ہے شاعر یا ادیب کی زندگی کو اس کی ذاتی خوشی، غمی اور معاملات کو معاشرے سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا کیوں کہ اس کی تحریر میں لفظ ''میں'' دراصل پورے معاشرے کی نشاندہی کرتا ہے اور اس کے پیچھے اس کا گہرا مشاہدہ ہوتا ہے وہ زندگی کی سچی تصویریں کھینچتا ہے۔ سیماب اکبر آبادی نے کیا خوب لکھا ہے:

''کہانی میری روداد جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اس کی داستاں معلوم ہوتی ہے۔''۲۴

اسی ضمن میں ساجد خان کا کہنا ہے:

''کوئی بھی تخلیق ہو اس کے پیچھے تخلیق کار کی فنی ریاضت، مشاہدے اور تجربے کے بے لاگ تجزیے کا عمل کارفرما ہوتا ہے۔ میں جب بھی اپنے افسانے کا پلاٹ تشکیل دیتا ہوں تو میری کوشش ہوتی ہے کہ جو بات کہوں اس کا اپنا ایک تاثر بن جائے۔ محض کہانیوں کا تانا بانا بُن دینے سے تخلیق کا کچا پن اسے اعلیٰ معیار کا فن پارہ نہیں بننے دیتا۔ فوری تاثر کے تحت کہانی لکھی جائے تو اس میں بے شمار جھول رہ جاتے ہیں۔''۲۵

کسی بھی ادب کو تخلیق کرنے کے لیے اس کے پیچھے تخلیق کار کا گہرا مشاہدہ ہوتا ہے وہ اپنے اردگرد ماحول کا گہرا مشاہدہ کرتا ہے اور وہ انسانی جذبات، احساسات، افکار و مسائل اور حادثات و واقعات کا حقیقی ترجمان ہوتا ہے کیوں کہ وہ وہی تخلیق کرتا ہے جو اُس نے دیکھا ہوتا ہے اور اپنے اوپر اُن حالات و کیفیات کو طاری کرتا ہے اور اپنے مسائل سمجھ کر اُن کا حل بھی تلاش کرتا ہے۔ جو بھی ادب تخلیق ہوتا ہے اُس کا زندگی کے کسی نہ کسی پہلو سے تعلق ہوتا ہے اگر ادب زندگی کو ایڈریس نہ کرے تو وہ ماورائی ہو کر اپنی اہمیت کھو دیتا ہے۔ آج کل کا جدید دور مشینی دور ہے اور پیسے کی ریل پیل ہے۔ معاشرے میں ہر شخص کسی نہ کسی مسلے سے دوچار ہے ہر جگہ دھوکہ دہی، دہشت گردی، جھوٹ، فساد اور دیگر مسائل نے ہر آدمی کو گھیرا ہوا ہے۔ کسی کے پاس کوئی وقت نہیں اور پیسے کی اتنی وقعت ہو چکی ہے کہ پیسہ ہی سب کچھ ہو کر رہ گیا ہے۔ جس سے اِنسانی رشتوں میں دراڑیں پڑ گئی ہیں یہ زندگی آسان بنا سکتا تھا مگر ایسا نہیں ہوا اور اس بات کو تسلیم کرنے سے قطعاً منہ نہیں موڑنا چاہیے۔ لیکن جن کے پاس پیسہ نہیں ہے وہ روزانہ کسی نہ کسی مسلے کا شکار رہتے ہیں کھانے کو روٹی، پہننے کو کپڑا اور سر چھپانے کو چھت میسر نہیں ہے۔ جہاں انصاف کے نام پر دھوکا دیا جا رہا ہو تو اس سچ کو فن کار اپنی تحریروں کے ذریعے اُجاگر کرتے ہیں کوئی بھی فن پارہ اُس کے ذہن میں آتا ہے تو وہ اس معاشرے کی اچھائی، برائی اس کی خوبصورتی کو لفظوں کا جامہ پہناتا ہے کیوں کہ کسی ادب تخلیق کرنے والے کی روداد اس کی تحریر دراصل معاشرے میں موجود عام فرد کی روداد ہوتی ہے جو اس پر گزر رہی ہوتی ہے ان مسائل سے تخلیق کار خود بھی دوچار ہوتے ہیں۔ اسی سلسلے میں ساجد خان کہتے ہیں:

''ہمارے شاعر یا ادیب کو بھی اُنہی مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، جن سے عام آدمی

دو چار ہے ۔غربت ، مہنگائی، بے انصافی، دھونس، دھاندلی، لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت گری وغیرہ اُسے بھی انہی ناسوروں کا سامنا ہے ۔ جب پیٹ میں روٹی نہ ہو،تن پر پہننے کے لیے کپڑا نہ ہو، رہنے کو مکان نہ ہو، بچوں کی فیس کے پیسے نہ ہوں اور شام ڈھلے یہ ضرورتیں چڑیلیں بن کر ڈرانے لگیں ضروریات تشنہ اور خواہشات دم توڑتی نظر آ رہی ہوں تو ادیب کیسا ادب تخلیق کرے گا ؟ اور اس کے لکھے ہوئے الفاظ کی پذیرائی نہ ہو رہی ہو تو وہ کیا لکھے گا اور کیسا لکھے گا کس کے لیے لکھے گا۔''۲۶

ادب اب بھی خاصی تعداد میں لکھا جا رہا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ، جن لوگوں کے لیے یہ تخلیق کیا جا رہا ہے وہ خود بلکہ پورا معاشرہ ہی تنزلی کا شکار ہو چکا ہے ان کے سوچنے سمجھنے کی حس ختم ہو چکی ہے۔ تخلیقِ ادب کے بارے میں ساجد خان کا کہنا ہے:

''ادب ہر صنف میں لکھا جا رہا ہے اور مختلف علاقائی زبانوں میں لکھا جا رہا ہے اس وقت لکھاری ہی ہیں جو کسی نہ کسی طور کم ہی سہی پر سچ کہہ رہے ہیں سچ بول رہے ہیں اپنے تئیں معاشرے کی کسی نہ کسی طور ترجمانی کر رہے ہیں ورنہ یہاں سچ بولتا ہی کون ہے یہ الگ بات ہے جن کو بتایا اور سنایا جا رہا ہے وہ اپنے گونا گوں مسائل میں اُلجھے ہوئے ہیں۔''۲۷

معاشرہ تنزلی کا شکار ہے کیوں کہ لوگوں کے اندر مادیت پرستی آ گئی ہے وہ سوچنے سمجھنے کی حس کھو چکے ہیں دل سے جو بھی فیصلے ہوتے ہیں وہ صحیح ثابت ہوتے ہیں اور جو دماغ سے فیصلے کرتے ہیں اس میں شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں اور انسان میں مادیت کا مادہ بھر جاتا ہے اس وجہ سے اس کی پسند ناپسند بدل جاتی ہے۔ انسان تن پروری میں لگا ہوا ہے، من پروری اُس کا مقصود ہی نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے ساری راحتوں کے باوجود اِنسان سکونِ قلب وروح کو ترس رہا ہے۔ آج کا اِنسان سوز وسازِ رومی سے تو دور ہے البتہ پیچ وتابِ رازی میں گرفتار ہے۔ بقول اقبالؒ:

''اسی کشمکش میں گزری میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومیؔ کبھی پیچ و تابِ رازیؔ''۲۸

دماغ ایجاد واختراع میں مصروف ہے اور روح نوحہ وماتم میں۔ ہماری تعلیم بھی پیٹ وتن پروری کا سامان کر

ہی دیتی روح پروری کا نہیں۔اسی وجہ سے اِنسان درندوں کی طرح مار دھاڑ کرتے ہوئے بلاتمیزِ حلال وحرام پیسے کے حصول میں لگا ہوا ہے۔دوسروں کے حقوق بھی مارتا ہے اور دوسروں کو بھی۔مولانا رومؒ نے ذیل کے شعر میں اسی حقیقت کو آشکار کیا ہے:

''علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود''۲۹؎

اس میں غیر منصفانہ معاشی اور سیاسی نظام کا بڑا عمل دخل ہے،جس نے پورا نظامِ زندگی تلپٹ کر دیا ہے اور ہم نے پیسے کو ہی سب کچھ جان لیا ہے اور سچ یہ بھی ہے کہ کسی فرد کو جو حقوق ملنے تھے وہ اُسے میسر نہیں،جس سے قوم بے یقینی کا شکار ہوئے جا رہی ہے اور ہر انسان اپنی ہی دینا میں مگن اپنا ہی پیٹ بھر رہا ہے اسے کسی دوسرے شخص سے کوئی سروکار نہیں اپنی ہی نسل کی بقا چاہتا ہے، جواُسے اچھے بُرے کی سمجھ بوجھ سے دور کر دیتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب حقداروں کو ان کا حق نہ ملے تو معاشرہ زوال کا شکار ہوتا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ ہر کوئی ادب تخلیق کر رہا ہے لیکن ادب کو ادب سمجھ کر نہیں کر رہا۔جب معاشرہ زوال کا شکار ہوتا ہے تو انسان اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتا ہے اور اس بے یقینی کی بدولت وہ معاشرے کے مسائل کے حل کے بجائے اُن کا رونا رو رہا ہے۔ادب تخلیق ہو رہا ہے تو محض اپنی بقا کے لیے،فنکار روٹی کپڑے کے تفکرات سے فرصت پائے تو تخلیقِ ادب کا فریضہ سرانجام دے۔اس ضمن میں ساجد خان کا کہنا ہے کہ:

''جن معاشروں نے ترقی کی ہے ان کا شاعر اور ادیب روزی روٹی کمانے کے چکروں میں نہیں پڑتا وہ فل ٹائم شاعر یا ادیب ہوتا ہے۔اور یہی اس کی روٹی روزی کا قابلِ عزت اور باوقار ذریعہ بھی ہوتا ہے ہمارے ہاں شاعری اور ادب اضافی شغل سمجھے جاتے ہیں پھر ترقی پسند یا جدیدیت کہاں سے آئے۔کون لائے گا؟''۳۰؎

ادبی نظریہ سے مُرادراصل ادب کی نوعیت اس میں جاری وساری شعریات،فلسفہ،حیاتِ انسانی،احساسات وجذبات، جمالیات، اخلاقیات، معاشیات،نفسیات،سماجیات وغیرہ اور تاریخی وعصری شعور کے کھوج کا نام ہے، جس سے معاشرہ ترقی کرتا ہے اور اس کے اندر موجود مسائل کا حل دریافت کرتا ہے جو ہر تخلیق کار،فن کار، شاعر یا ادیب کے لیے لازم وملزوم ہے۔اس ضمن میں حرف اکادمی پاکستان کے چیئرمین کرنل ریٹائرڈ سیّد مقبول حسین کا کہنا

ہے:

''ساجد خان ادبی دنیا میں بے حد فعال ہے حرف اکادمی ہزارہ میں مختلف حیثیات میں کام کر چکے ہیں آج کل تنظیم کے کوآرڈینیٹر ہیں ان کی غیر ادبی مصروفیات انہیں ادب سے دور نہیں رکھ سکتیں۔ادبی کاموں میں مشغول لوگ جو غیر کاموں میں مصروف ہوتے ہیں تو اُن کا ذہن ادبی تانے بانے بُنتا رہتا ہے یہ نشہ سوتے جاگتے اُن کے ذہن پر چھایا رہتا ہے غیر ادبی مصروفیات کا ساجد خان کی سرگرمیوں پر کوئی اثر نہیں ہے۔''[۱۳]

حلقۂ احباب:

ساجد خان کے ادبی حلقۂ احباب میں شامل افراد میں چند ایک یہ ہیں:

پروفیسر خورشید احمد عون، پروفیسر ڈاکٹر عادل سعید قریشی، جانِ عالم، راجا ریاض الرحمٰن، پروفیسر ڈاکٹر سفیان صفی، محمد بشیر رانجھا، سید انوار الحق سید، پروفیسر فرحان انجم، اجمل نذیر، پروفیسر بشیر احمد سوزؔ، پروفیسر ریٹائرڈ یحییٰ خالد، کاشف بٹ، عبدالوحید بسمل، قمر زمان، عامر سہیل، ریاض ساغر، امان اللہ خان، وحید قریشی، خالد محمود قریشی، ضیاالرشید، ساجد حمید ساجد، سعید صاحب، الیاس بابر اعوان، پروفیسر ملک ناصر داؤد، میاں محمد اعظم، خداداد خالد، جاوید اقبال راجا، پروفیسر ریٹائرڈ محمد زمان مضطر، محمد اسفر آفاقی، عمر علی دائم، پروین سیف، سید ماجد شاہ، امتیاز الحق امتیاز، عدالت خان عدالت، االطاف حسین الطاف، جعفر محمود ہاشمی، محسن چوہان، سنفر سامی، ابرار ابہام، افتخار حسن قریشی، مشتاق احمد، سہیل احمد صمیم، ابراہیم نشیب، بلال ادرا اور دیگر بہت سے شاعر اور ادیب ان کے حلقۂ احباب میں شامل ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔بشیر احمد سوزؔ، ہزارہ میں اُردُو افسانہ کی روایت، ادبیات ہزارہ، (مرکز تحقیق و اشاعت)، ۲۰۱۰ء، ص ۴۳۴

۲۔انٹرویو، تنویر الٰہی، رہائش گاہ حویلیاں گاؤں، ۱۸ اپریل ۲۰۲۱ء، بوقت 12 بجے دن

۳۔انٹرویو، غلام مرتضٰی، گورنمنٹ ماڈل ہائی سکول حویلیاں، ۱۳ اپریل ۲۰۲۱ء، بوقت 2 بجے دن

۴۔ساجد خان، مجھے روشنی چاہیے، فرینڈز پبلشرز، راولپنڈی، ۲۰۱۱ء، ص ۱

۵۔انٹرویو، نعیم عرف پپو، رہائش گاہ حویلیاں گاؤں، ۱۵ اپریل ۲۰۲۱ء، بوقت 11 بجے دن

۶۔ساجد خان، مجھے روشنی چاہیے، ص ۱

۷۔محمد بشیر رانجھا، ساجد خان فکر و فن، فرینڈز پبلشرز، راولپنڈی، ۲۰۱۹ء، ص ۲۹

۸۔انٹرویو، ملک شاہد اعوان، گورنمنٹ ماڈل ہائی سکول حویلیاں، ۱۵ اپریل ۲۰۲۱ء، بوقت 2 بجے دن

۹۔انٹرویو، مفتی حفیظ الرحمٰن طاہر، گورنمنٹ ماڈل ہائی سکول حویلیاں، ۱۵ اپریل ۲۰۲۱ء، بوقت 1 بجے دن

۱۰۔انٹرویو، غلام مرتضٰی، گورنمنٹ ماڈل ہائی سکول حویلیاں

۱۱۔علامہ اقبال، کلیات اقبال، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۲۹۶

۱۲۔محمد بشیر رانجھا، ساجد خان فکر و فن، ص ۱۱

۱۳۔انٹرویو، ملک عرفان، رہائش گاہ حویلیاں گاؤں، ۱۸ اپریل ۲۰۲۱ء، بوقت 1 بجے دن

۱۴۔انٹرویو، محمد زاہد قریشی، رہائش گاہ حویلیاں گاؤں، ۱۸ اپریل ۲۰۲۱ء، بوقت 1:30 بجے دن

۱۵۔انٹرویو، عادل سعید قریشی، ایبٹ آباد پبلک سکول، ۲۲ اپریل ۲۰۲۱ء، بوقت 12 بجے دن

۱۶۔انٹرویو، عبدالرحمٰن جاوید، گورنمنٹ ماڈل ہائی سکول حویلیاں، ۱۵ اپریل ۲۰۲۱ء، بوقت 1 بجے دن

۱۷۔محمد بشیر رانجھا، ساجد خان فکر و فن، ص ۱۱

۱۸۔انٹرویو، تنویر الٰہی، رہائش گاہ حویلیاں گاؤں

۱۹۔ محمد بشیر رانجھا، ساجد خان فکر و فن، ص ۶۶، ۶۷

۲۰۔ انٹرویو، ملک عرفان، رہائش گاہ حویلیاں

۲۱۔بشیر احمد سوزؔ، ہزارہ میں اُردُو افسانہ کی روایت، ص ۴۳۴

۲۲۔محمد بشیر رانجھا، ساجد خان فکر و فن، ص ۷، ۸

۲۳۔بدر منیر، اظہار خیال، تقریب پذیرائی ''دائرے کا اسیر'' ۱۹ نومبر ۲۰۱۷ء، ایمز اکیڈمی حویلیاں

۲۴۔خواجہ محمد زکریا،انتخاب زریں،سنگیت پبلی کیشنز،۲۰۰۹ء،ص۲۱۱

۲۵۔روزنامہ،k2 ٹائمز،ایبٹ آباد،بدھ ۳۰ اکتوبر،۲۰۱۳ء

۲۶۔ایضاً

۲۷۔ایضاً

۲۸۔علامہ اقبال،کلیاتِ اقبال،ص۳۵۴

۲۹۔ایضاً،ص۴۶۲

۳۰۔روزنامہ،k2 ٹائمز،ایبٹ آباد،بدھ ۳۰ اکتوبر،۲۰۱۳ء

۳۱۔انٹرویو،کرنل سید مقبول حسین،دفتر حرف اکادمی ہزارہ حویلیاں،۲۶ اپریل ۲۰۲۱ء،بوقت 1 بجے دن

بابِ دوم:

اُردُو افسانے کا آغاز وارتقا: ایک جائزہ

افسانہ کی تعریف:

افسانہ قصہ کہانی کی وہ شکل ہے ، جس کے لیے انگریزی میں Short Story کا لفظ استعمال ہوا ہے۔افسانہ ناول کی ترقی یافتہ صورت ہے، جو اُردُو ادب میں خاص مقام و مرتبے کی حامل ہے ۔ بقول رفیع الدین ہاشمی:

> ''افسانہ (یا مختصر افسانہ) قصہ کہانی کی وہ شکل ہے جس کے لیے انگریزی میں Short Story کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور یہ داستان اور ناول کی ارتقائی اور ترقی یافتہ صورت ہے۔''[۱]

افسانہ ایسی تحریر ہوتی ہے، جو کسی بھی معاشرے میں رہنے والے افراد کی زندگی کا کوئی ایک پہلو اُجاگر کرتی ہو۔افسانہ ایک مختصر کہانی ہوتی ہے جسے آدھ یا ایک گھنٹے میں پڑھا جا سکتا ہے۔اڈگر ایلن پو جو کہ مختصر افسانے کے موجد مانے جاتے ہیں ، انہوں نے اپنی کتاب(The Reader Companion The World Of Literature)میں مختصر افسانے کی تعریف اس انداز سے کی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''مختصر افسانہ ایک ایسی بیانیہ صنف ادب ہے، جو اتنی مختصر ہو کہ ایک بیٹھک میں ختم کی جا سکے ۔ جسے قاری کو متاثر کرنے کے لیے لکھا گیا ہو اور جس سے وہ تمام غیر ضروری اجزا نکال دیے گئے ہوں، جو تاثر رکھنے میں معاون نہ ہو۔''[۲]

اے۔جے۔جے راکلف(A.J.J Ratcliff)نے لکھا ہے کہ:

> ''مختصر افسانہ سیدھی سادی کہانی نہیں بلکہ ایک ایسی فنی تخلیق ہے، جس میں فنکار کے ارادے اور حکمت کو دخل ہوتا ہے''[۳]

ایچ۔جی۔ویل(H.G.Well)نے مختصر افسانے کی تعریف کرتے ہوئے اسے:

''قصے کی ایسی قسم بتایا ہے۔ جسے وہ آدھے گھنٹے میں پڑھا جا سکتا ہے۔''۴

ڈبلیو. بی. پٹکن (W.B.Pitkin) نے مختصر افسانے کو:

''ایسا بیانیہ ڈراما بتایا، جو وحدتِ تاثر پیدا کرے۔''۵

آئی. بی. ایسون (I.B.Esenwein) نے ذرا تفصیل سے تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''مختصر افسانہ ایک تخیلّی تخلیق ہے، جس سے کسی ایک مخصوص واقعے یا مخصوص کردار کا نقش پلاٹ کے ذریعے اس طرح اُبھارا جاتا ہے کہ پلاٹ کی ترتیب و تنظیم سے ایک مخصوص (واحد) تاثر پیدا ہو سکے۔''۶

اس کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں:

''اس سے (مختصر افسانہ) مُرادنثر میں ایک مختصر سادہ قصہ ہے، جس میں زندگی کے کسی ایک پہلو کو بے نقاب کیا گیا ہو۔''۷

پروفیسر سیّد وقار عظیم لکھتے ہیں:

''افسانہ ناول کی طرح زندگی کی زنجیر نہیں اس کی ایک کڑی کا ترجمان بنتا ہے کوئی ایک شخص، کوئی ایک واقعہ، کوئی ایک تجربہ، خیال یا احساس ان میں سے کوئی ایک ہی چیز ایک وقت افسانہ کا موضوع بن سکتی ہے''۸

افسانہ نگاری وہ فن ہے جو ایک موضوع پر مختصر طریقے سے لکھا جائے وہ مقصد بیان کرنے کے ساتھ اپنی انفرادیت بھی نہ کھوئے اور پڑھنے والے کے ذہن پر ایک دلچسپ اور مثبت اثر چھوڑے۔ فن کار اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اور اپنے گہرے مشاہدے کی بنیاد پر قاری کی توجہ ایک خاص دائرے میں محدود رکھتے

ہوئے لامحدود باتیں کہہ دیتا ہے۔ڈاکٹر سلیم اختر اس ضمن میں لکھتے ہیں:

’’افسانہ افراد کو موضوع بناتا ہے اور ان ہی سے مکالمہ کرتا ہے اس ضمن میں افسانہ نگار کے لیے یہ امر خاصی دقت کا باعث ہوسکتا ہے کہ معاشرہ پرتنوع افراد پر مشتمل ہوتا ہے تو قوم بھان متی کا کنبہ؛ اب افسانہ نگار کو خطاب کس سے ہو؟ لہٰذا وہ کسی ایک فرد یا خاص فرقہ کو مخاطب کیے بغیر عمومی انداز میں بات کرتا ہے لیکن ہیئت اور اسلوب کا یہ کمال ہے کہ قاری افسانے کو اپنے لیے سمجھ کر اس سے لطف اندوز ہوتا ہے۔‘‘ ۹

افسانہ لکھنے کا مقصد کسی واقعہ یا کہانی کو پیش کرنا ہے۔کہانی سننا سنانا انسانی فطرت میں ہے اور اس کے لیے کہانی بھی اتنی قدیم ہے جتنی انسان کی تہذیب،انسان نے جب بولنا سیکھا تو اپنے خیالات،احساسات کو دوسروں تک پہنچانے کی کوشش میں اپنی بات کو دلچسپ انداز میں بیان کرنے لگا۔لیکن انسان شروع میں بالکل ایک حیوان کی طرح تھا نہ اُسے رہن سہن کا طریقہ آتا تھا نہ بولنے کا طریقہ آتا تھا۔اپنا مقصد دوسروں تک پہنچانے کے لیے اور اپنے ہاتھوں اور جسم کے مختلف حصوں سے اشاروں کے ذریعے اپنی بات کو آگے پہنچاتا تھا پھر زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ ترقی کرتا چلا گیا اور بول چال کا ہنر اس کو آ گیا جس سے کہانی نے جنم لیا۔نثری ادب میں جتنی بھی صنفیں ہیں وہ سب انسان کی فطرت کی مرہونِ منت ہے،جس کی بدولت وقت گزارنے کے لیے یا تھکان دور کرنے کے لیے کہانی سنی اور سنائی جاتی تھی۔اس سلسلہ میں فرزانہ شاہین لکھتی ہیں:

جب انسان بول چال کے آرٹ سے محروم تھا تو اپنی بات کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے وہ اشاروں کا سہارا لیتا اور اپنی حرکات وسکنات اپنی جسمانی قوتوں کے سہارے اپنی بات دوسروں تک پہنچاتا رہا ہے۔‘‘ ۱۰

انسان نے جب گویائی کے منازل کو طے کیا اور اپنے مقاصد کو،اپنی بات کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے اس میں دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے زیادہ سے زیادہ پُرکشش الفاظ میں واقعات کو پیش کرنا شروع کیا۔تو اُس زمانے میں تھکے ہارے لوگ اپنی تکان دور کرنے کے لیے ایک حلقے میں بیٹھ کر کہانی سنتے اور سناتے تھے،جس سے قصہ کہانی کی روایت قائم ہوئی۔اسی طرح اُردو افسانے کی بات ہوگی تو اس سے پہلے ہمیں داستان کا حوالہ دینا ہوگا کیوں کہ

افسانہ داستان ہی کی ترقی یافتہ صورت ہے اِسی لیے افسانہ کا مآخذ بھی کہانی ہی ہے۔انور جمال لکھتے ہیں:

''افسانہ داستان کی ترقی یافتہ صورت ہے، جو مافوق الفطرت اور غیر عقلی واقعات کا پلندہ تھی،نسبتاً حقیقی شکل میں ناول بنی اور پھر بیسویں صدی کے مشینی دور نے اسے مزید نکھار کر افسانہ بنا دیا۔مگر ناول اپنی جگہ الگ صنفِ نثر کے طور پر بحال رہا۔''[۱۱]

افسانہ میں حقیقی زندگی کی تصاویر کو اُجاگر کیا جاتا ہے یعنی انسان کو جن چیزوں کا ارمان تھا وہ افسانے میں شامل کر دی گئیں جو معاشرے میں کسی فرد کے جذبات، احساسات، خواہشات کا اظہار اور اس سے محرومیوں کا ذکر ہے۔اس ضمن میں سیّد وقار عظیم رقمطراز ہیں:

''افسانہ کہانی میں پہلی مرتبہ وحدت تاثر کی اہمیت کا مظہر بنا کسی ایک واقعہ، ایک جذبے، ایک احساس، ایک تاثر ،ایک اصلاحی تنقید، ایک رومانی کیفیت کو اس طرح کہانی میں بیان کرنا کہ وہ دوسری چیزوں سے الگ اور نمایاں ہو کر پڑھنے والے کے جذبات واحساسات پر اثر انداز ہو،افسانہ کی وہ امتیازی خصوصیت ہے جن نے اسے داستان اور ناول سے الگ کیا ہے۔''[۱۲]

افسانہ مختصر ہونا چاہیے، جس میں زیادہ سے زیادہ وقت صرف نہ کرنا پڑے کیوں کہ آج کل تیز رفتار زمانے اور سائنسی زندگی میں کسی کے پاس اتنا وقت میسر نہیں کہ وہ طویل قصے کہانیوں کو پڑھے اس لیے اچھا افسانہ وہی ہوگا جو آدھ سے ایک گھنٹے کے مطالعہ تک طوالت میں ہو اگر اس کو زیادہ پھیلایا جائے گا تو اس کی انفرادیت میں کمی آجائے گی انسان کی خواہش کے مدِنظر افسانہ کے فن میں بیک وقت حقیقت، رومان اور اختصار یکجا ہے اور افسانہ کا یہی اختصار قاری پر اپنی قدر و منزلت مرتب کرتا ہے۔

اِس کے ساتھ افسانے میں رمز و ایما بھی بنیادی چیز ہے کیوں کہ افسانے میں غزل کی طرح وضاحت سے کام نہیں لیا جاتا۔افسانے میں کسی مقصد، کسی واقعہ کو قاری کے سامنے پیش کر دیا جاتا ہے کیوں کہ افسانے کے اندر کوئی واضح آغاز اور انجام نہیں ہوتا لہٰذا قارئین خود ہی کوئی نہ کوئی نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں۔سید عابد علی لکھتے ہیں:

''مختصر افسانے میں غزل کی طرح رمز و ایما کا کھیل بڑی خوبصورتی سے کھیلا جا سکتا

ہے۔اس فن کے دائرے میں بھی اجمال سے تفصیل تراوش کرتی ہے اور ایہام پر توضیح تصدق ہوتی ہے۔''۱۳

الغرض مختصر افسانے کے فن پر جتنے بھی ناقدین اور کتابوں کی آرا جمع کرلیں پھر بھی کوئی حتمی رائے قائم نہیں کر سکتے کیوں کہ جدید افسانے میں بے شمار تبدیلیاں ہوگئی ہیں اگر کسی بھی بلند پایہ اور معیاری افسانوں کو سامنے رکھا جائے اور جو تعریف کی جائے وہ افسانے کے سارے پہلوؤں کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں نہیں لے سکتی اسی وجہ سے افسانے کی واضح اور جامع تعریف ممکن نہیں۔افسانے کی کتابی تعریفوں کے مقابلے میں بڑے تحقیق کاروں کے جملے زیادہ وضاحت کریں گے۔جیسے گابریل مرکیوز نے کہا:

''جب یونسؑ نے اپنی بیوی کو بتایا کہ میں تین دن مچھلی کے پیٹ میں رہا ہوں تو اس نے اسے ایسے دیکھا جیسے وہ کہانی سنا رہا ہو۔''۱۴

اُردُو افسانے کی مختصر روایت:

اُردُو میں مختصر افسانہ مغرب سے آیا۔اڈگر ایلن پو کو مغربی افسانے کا موجد قرار دیا جاتا ہے،نثری ادب میں اُردُو افسانے کو انگریزی ادب کے ذریعے متعارف کرایا گیا۔اُردُو افسانے کی روایت کے متعلق عبادت بریلوی یوں رقمطراز ہیں:

اُردُو افسانے کی روایت میں ایسی کوئی چیز نہیں ملتی جس کے باعث مختصر افسانہ فطری طور پر رائج ہوتا۔اس کا بیج یہاں کی ادبی زمین میں پھوٹا نہیں بلکہ مغرب سے اس کا پودا لاکر لگایا گیا۔''۱۵

مختصر افسانے کی عمر اتنی زیادہ نہیں ہے لیکن دیکھتے ہی دیکھتے اتنے کم عرصے میں مقبولیت کی حد تک پہنچ گیا اور سارے لکھاری سامنے آئے جنھوں نے صنفِ افسانہ کو بلندیوں تک پہنچایا۔نثری ادب کی اس صنف نے دوسری اصناف کی طرح الگ پہچان بنائی۔افسانہ ایک صنف کی حیثیت سے متعارف ہونے سے پہلے ہمارے معاشرے، ہماری تہذیب میں فن قصہ گوئی،کہانی سننا سنانا اور داستان موجود تھی۔قصوں سے انسان کا تعلق نیا نہیں ہے یہ قدیم دور

سے چلتا آ رہا ہے انسان سے اس کی دلچسپی پہلے سے موجود تھی اور یہی وجہ ہے کہ اس فن کا آغاز مصوری یعنی پُرانے وقتوں میں انسان اپنی بات، اپنے خیالات دوسروں تک پہنچانے کے لیے یہ فن استعمال کرتے تھے اور یہ فن بت تراشی اور دیگر فنون سے پہلے ہوا۔ اس ضمن میں عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

''(یہ) دنیا کا سب سے قدیم فن ہے جس زمانے میں مصوری، بت تراشی اور دیگر فنونِ لطیفہ مستور بلکہ خیال میں بھی دور تھے، افسانہ دنیا سے روشناس ہو چکا تھا اور اپنے منتہائے پیدائشی کو بوجوہ احسن پورا کر رہا تھا۔ یونانی نقطہ نظر سے یہ فن شاعری اور موسیقی سے بھی زیادہ قدیم ہے، اس کی جہانگیری کا یہ حال ہے کہ کائنات کے کسی گوشے میں ایسی قوم کا پتا نہیں چلتا جس کے کان قصوں سے ناآشنا ہوں۔''[۱۶]

ویسے دیکھا جائے تو صنفِ افسانہ اُردو ادب کے لیے بیسویں صدی میں ایک اہم اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ ہرگز اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ اس صنف سے پہلے قصہ کہانیوں کا رواج موجود نہیں تھا۔ یہ روایت باقاعدہ طور پر نثری داستان کی شکل میں موجود تھی اور ان کے پلاٹ بڑے وسیع اور پیچیدہ ہوتے تھے داستانوں کے زمانے میں لوگوں کی مصروفیات زیادہ نہیں تھیں اور ان قصہ کہانیوں کے علاوہ وقت گزاری کا کوئی اور ذریعہ نہیں تھا چنانچہ اس زمانے میں اسی طرح کے طوالت بھرے قصے کہانیاں سنتے سناتے تھے اور پسند بھی کی جاتی تھیں لیکن جیسے جیسے زمانے کے تقاضے بدلتے گئے ادب اور زندگی مشینی ہوتی گئی۔ انسان کی مصروفیات بڑھتی گئی تو لوگوں کے پاس اس سے لطف اخذ کرنے کے لیے وقت نہ رہا اور داستانوی کہانیوں میں فرضی اور دیومالائی عناصر زندگی کے تجربات اور مشاہدات کا ساتھ دینے کے قابل نہ رہے تو انسان کے عصری تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے افسانہ آگے بڑھا۔ افسانہ حقیقی زندگی کی عکاسی اور مختصر ہونے کے باعث آج کی مقبول ترین صنفِ ادب ہے۔

جہاں تک افسانے کے تاریخی ارتقا کے پس منظر کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں بہت سے نقادوں نے بہت سے نظریات پیش کیے، کچھ نقاد پریم چند کو پہلا افسانہ نگار مانتے ہیں اور کچھ کا خیال ہے کہ پریم چند سے پہلے ہی اس صنف کا آغاز ہو گیا تھا۔ کچھ نقادوں کے نزدیک اس نثری صنف کو اُردو میں سجاد حیدر یلدرم نے روشناس کرایا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری یوں رقمطراز ہیں:

''اُردو کے پہلے افسانہ نگار پریم چند نہیں، سجاد حیدر یلدرم ہیں، اُردو کا پہلا افسانہ، پریم

چند کا ''انمول رتن'' نہیں بلکہ یلدرم کا ''نشے کی پہلی ترنگ'' ہے۔''۱۷

ابتدائی افسانہ نگار:

اُردو کے ابتدائی افسان نگاروں میں یہ تعین کرنا مشکل ہے کہ پریم چند پہلے افسانہ نگار ہیں یا سجاد حیدر یلدرم پہلے افسانہ نگار۔ رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

''اُردو میں پریم چند کو پہلا افسانہ نگار کہا جاتا ہے مگر اُن کے ابتدائی افسانوں سے پہلے سجاد حیدر یلدرم بعض ایسی کہانیاں لکھ چکے تھے، جو مختصر افسانے کے معیار پر پورا اترتی ہیں۔ پریم چند نے پہلا افسانہ ۱۹۰۶ء یا ۱۹۰۷ء میں لکھا جب کہ یلدرم کا پہلا افسانہ ۱۹۰۳ء میں شائع ہوا۔''۱۸

پریم چند نے ابتدائی افسانوں میں انسان کو اپنے عہد کی ذہنی تسکین، اطمینان، سرور و انبساط کا سرمایہ بھی دیا، جس کی اِنسان کو ہمیشہ سے ضرورت رہی ہے، عدیم الفرصتی کی وجہ سے قریب قریب مفقود ہو رہا تھا انھوں نے مختصر افسانے جیسی صنف دے کر اِنسان کی نفسیاتی اور جذباتی ضرورتوں کا وسیلہ بھی پیدا کیا اور اپنے گہرے مشاہدے سے زندگی کے تقاضوں کی تکمیل میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کا سب سے پہلا افسانہ ''سوزِ وطن'' ہے جو وطن سے محبت کا والہانہ اظہار ہے۔ اس ضمن میں سیّد وقار عظیم رقمطراز ہیں:

''پریم چند کے ابتدائی افسانوں کا مقصد یہ ہے کہ ان کے ذریعے قوم میں محبت اور اس محبت میں اپنا تن، من، دھن سب کچھ نثار کر دینے کا جذبہ پیدا کیا ہے۔''۱۹

یہ افسانوی مجموعہ جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہو کر تخلیق ہوا، جس سے قوم کو بیدار کرنا تھا اور وطن کے لیے سب کچھ لوٹانا اور اس کی بنیادی وجہ؛ ڈاکٹر پروین اظہر اپنی کتاب مختصر افسانہ نگاری کی تنقید میں لکھتی ہیں کہ:

''اس زمانے کی سیاست کا رنگ ہندوستان کی زندگی پر غالب نظر آتا ہے دوسری تمدنی تحریکوں کی نسبت یہ معلوم ہوتا تھا کہ اب ان پر بھی سیاست کا رنگ چڑھ چکا ہے۔''۲۰

پریم چند نے نوجوانوں میں خوداعتمادی پیدا کرنے کی غرض سے تاریخی افسانے لکھے۔انھوں نے افسانے متوسط طبقے کے لوگوں کے لیے، جواندھیرے میں زندگی گزار رہے تھےاور روشنی کا کوئی راستہ دیکھائی نہیں دیتا تھا،اور نہ ہی کوئی ذریعہ تھااوراتنی محنت کرنے کے باوجودان کی زندگی سنسان تھی۔اس نچلے طبقے کے لیےانھوں نے جدوجہد کی وہ پہلےفن کار ہیں جنھوں نے ادب میں ہندوستانی فضا اوراوراس کے ماحول کو پیش کیا اور پہلی بار دیہاتی زندگی کی عکاسی اپنے افسانوں میں کی۔ڈاکٹر پروین اظہر یوں رقمطراز ہیں:

''عام طور پرشہر کےتعلیم یافتہ اورمتوسط طبقے کوگاؤں کے کروڑوں مفلوک الحال کسانوں کی زندگی کی طرف توجہ کرنے اوران سے جوڑنے کا کام مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو جیسے سیاسی رہنماؤں کی طرف منسوب کیا جاتا ہےمگر پریم چند نے ہندوستانی سیاست میں اس کےطلوع ہونے سے پہلے ۱۹۱۰ء سے۱۹۱۴ءتک بے غرض محسن،صرف ایک آواز اورخون جیسی کہانیاں لکھیں،جن کے ہیروکسان اور وہی مزدور ہیں جن میں پریم چند نے پولیس، مہاجنوں، مہنتوں اورزمینداروں کے ہاتھوں کسانوں کی تباہی کے قصے سنائے۔''[۲۱]

پریم چند کا بڑا مقصد معاشرتی اصلاح تھاانھوں نے اپنے ملک اور معاشرے کےافراد کوموضوع بنایاانھوں نے دیہاتی معاشرے کی پسماندگی کا نقشہ کھینچاہےان کےافسانے''کفن''اور''سواسیر گیہوں''ایسےہی انسانی المیوں کو سامنے لاتے ہیں۔دیہات میں زمینداراوروڈیرےغریب کسانوں پرکون سےظلم ڈھارہے تھےانھوں نے اپنے افسانوں میں اس تلخ حقیقت کونمایاں کیا اور قاری اس کرب کومحسوس کیے بغیرنہیں رہ سکتا۔ان کے اولین افسانوی مجموعے''سوزِوطن''،''پریم پچیسی''،''پریم بتیسی''ہیں۔سوزِوطن کوانگریزی حکومت نے باغیانہ قرار دے کرضبط کرلیا لیکن اس کے باوجودانھوں نے اس سےکہیں زیادہ معیاری اور بلند پایہ افسانے لکھے،جوفنی معیار پر پورا اُترنے کے ساتھ ساتھ گہری مقصدیت کے حامل بھی ہیں۔ان کے ہم عصروں میں سجادحیدر یلدرم،جورومانیت پسند افسانہ نگار ہیں ان کے افسانوں کا مجموعہ''خیالستان''ہے۔سیّد وقارعظیم لکھتے ہیں:

''یلدرم کےافسانوں میں فن کے مزاج اوراس کی فطرت کےاحترام اورانہیں فکروعمل کےمنطقی حدود میں رکھنے کی عام روش کےساتھ ساتھ مناظرفطرت کی رنگینیوں اور بہار آفرینیوں کوجذبہ محبت اوررومان کا پس منظر بنانے اورانسانی جذبات اورحسن فطرت

میں باہمی ربط و آہنگی پیدا کرنے کا رجحان داستانی فن کی روایات سے لگاؤ کا نتیجہ
ہے۔''۲۲؎

اس کے علاوہ سلطان حیدر جوش کے اکثر اصلاحی ناول قابلِ ذکر ہیں انھوں نے مغربیت اوراس کے مختلف عناصر کے خلاف علم جہاد بلند کیا۔ بقول سیّد وقار عظیم:

''سلطان حیدر جوش کے افسانوں کی بنیاد اس جذبہ اور احساس پر ہے کہ مشرق والوں (یعنی ہندوستانیوں) کو مغربی تعلیم اور تہذیب کے فریب سے محفوظ رکھا جائے۔''۲۳؎

ابتدائی افسانہ نگاروں میں نیاز فتح پوری کا نام بھی اہمیت رکھتا ہے ان کا افسانوی مجموعہ ''نگارستان'' اور اس میں بھی بالخصوص 'کیوپڈ و سائکی' اور 'حمرا کا گلاب' وغیرہ اس رنگین روایت کی نشانیاں اور یادگاریں ہیں۔ انھوں نے اپنے طرزِ تحریر میں قاری کی دلچسپی کو سب سے پہلی جگہ دی ان کے افسانوں میں حسن وعشق کے ذکر میں ہیجان انگیزی کا رجحان اسی نقطۂ نظر کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اس ضمن میں سیّد وقار عظیم لکھتے ہیں:

''نیاز نے حال کی زندگی اور اس کی قیدو بند سے آزاد ہو کر والہانہ عشق ومحبت کی ایک دُنیا آباد کی ہے۔''۲۴؎

اُردُو کے ابتدائی افسانہ نگاروں میں پریم چند، سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش اور نیاز فتح پوری کے نام سب سے نمایاں ہیں ان چار ابتدائی افسانہ نگاروں نے اپنے اپنے مشاہدے اور مزاج کی مناسبت سے کہانی سے مختلف طریقوں سے مختلف کام بھی لیے افسانہ جب ایک صنف کی حیثیت سے اُردُو میں داخل ہوا تو زندگی کے بے حد قریب بھی رہا اور دُور بھی، وہ تلخ حقیقتوں کا ترجمان بھی بنا اور شیریں حکایتوں کا نغمہ خواں بھی، محبت ونفرت، سیاست، معیشت، اخلاق سب اس کے موضوع رہے اس نے تاریخ، مشاہدہ، روایت، تخیل اور تصور کی دکھائی ہوئی روشنی میں نئی دُنیا آباد کی اس نے بیک وقت بہت سے کام سرانجام دیے عشق ومحبت کا، محرومیوں کا گویا مختصر افسانے کا آغاز حقیقت، شعریت، صداقت اور تصور، زندگی اور فن کے امتزاج کا ابتدائی نقش، یہی نقش آگے چل کر زیادہ اُبھرا،

زیادہ چمکا اور زیادہ دلنشین بنا۔علی عباس ،اعظم کریوی نے پریم چند کی اصلاح پسندانہ روایت کو آگے بڑھایا۔ پریم چند، سجاد حیدر یلدرم ، سلطان حیدر جوش اور نیاز فتح پوری کی رکھی گئی بنیاد پر بہت سے افسانہ نگار سامنے آئے جن میں علی عباس حسینی ، مجنوں گورکھ پوری، اعظم کریوی، ل۔احمد اکبرآبادی ، حامداللہ افسر ،فضل حق قریشی،محشر عابدی، طالب باغپتی ،مسعودعلی ذوق اور کوثر چاند پوری نے افسانوی فن کی ایسی عمارت کھڑی کی ،جس میں زندگی کی حقیقتیں فن کی رعنایاں آمنے سامنے ہاتھ پکڑے اور ایک دوسرے کو سہارا دیتی دکھائی دیتی ہیں ۔اس ضمن میں سیّد وقار عظیم یوں رقمطراز ہیں:

''ہمارے ابتدائی افسانہ نگاروں نے افسانے کی حقیقت وشعریت ،صداقت وتخیل اور زندگی وفن کے امتزاج کا جو نقش اوّل بنایا تھا اسے ان افسانہ نگاروں نے زیادہ اُبھارہ، چمکایا اور رنگین بنایا۔'' ۲۵

سنہ ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۰ء کے بعد سے البتہ افسانوں میں زندگی کے نقش زیادہ گہرے ہوتے نظر آتے ہیں۔ کیوں کہ اس میں وہ حقیقت بیان کی جاتی ہے، جو موجودہ زمانے اور آئندہ زمانے کے لیے ہوتی ہے اور اپنے گہرے اثرات چھوڑ جاتی ہے۔اس زمانے کے سخت کفایت شعارانہ رویے اور سیاسی پریشانی نے ہر ہوش مند انسان کے دل میں انسانیت کی خدمت کا جو جذبہ پیدا کیا تھا اسے ہمارے افسانہ نگاروں نے اپنا ادبی منصب سمجھنے کی طرف پہلی مرتبہ قدم بڑھایا۔اسی عرصہ میں فیاض محمود، حیات اللہ انصاری،عظیم بیگ چغتائی،خواجہ حسن نظامی، راشد الخیری اوراختر انصاری بڑے عمدہ اور معیاری افسانے لکھ رہے تھے۔بقول رفیع الدین ہاشمی:

''خواجہ حسن نظامی کے افسانے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے متعلق ہیں اور اپنے رنگ میں منفرد ہیں'' ۲۶

اسی طرح سنہ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۵ء کے عرصے میں کچھ ایسے افسانہ نگار ہیں جن کے کام کا زیادہ حصہ اس عرصے میں موجود ہے جن میں خواجہ منظور احمد، محمد مجیبؔ، منصور احمد، سجاد ظہیر، اختر حسین رائے پوری، حیات اللہ انصاری اوراختر انصاری کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔انھوں نے عمدہ افسانے لکھ کر اُردو افسانے کے ذخیرہ میں قابلِ قدر اضافہ کیا۔

ترقی پسند افسانہ نگار:

ترقی پسند افسانہ نگاروں کا تعارف کروانے سے پہلے ''انگارے'' کی اشاعت کے بارے میں مختصر بات مناسب ہوگی۔۱۹۳۲ میں چار افسانہ نگاروں سجاد ظہیر، رشید جہاں، احمد علی اور محمود الظفر کا دس افسانوں کا مجموعہ شائع ہوا۔اس مجموعے کی اشاعت نے سماج میں انقلاب برپا کر دیا۔اس مجموعے کے خلاف صفحات سیاہ ہونے لگے۔اس سلسلہ میں ڈاکٹر خالد علوی لکھتے ہیں:

> ''انگارے کی مخالفت میں اولین مضمون ۲۵ ِ جنوری ۱۹۳۳ء میں 'سرفراز' میں شائع ہوا،جس کا عنوان تھا ''دُنیائے مذہب میں ایک فتنہ'' یکم فروری ۱۹۳۳ء میں انگارے کی اخلاقی حیثیت کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا جس کے مطابق انگارے مخربِ اخلاق کتاب تھی ۔۲۱ ِ فروری ۱۹۳۳ء کے 'سرفراز' میں عبدالحمید خان خفی کا مضمون ''راجپال کی روح'' شائع ہوا جس میں سجاد ظہیر کا نام لیے بغیر ان کو راج پال اور رنگیلا رسول کے مصنف کی روح قرار دیا گیا۔'' ۲۷

انگارے میں سجاد ظہیر کے پانچ افسانے شامل تھے جن میں ''نیند نہیں آتی''، ''جنت کی بشارت''، ''گرمیوں کی ایک رات''، ''دلاری''، ''پھر یہ ہنگامہ''،احمد علی کے دو افسانے ''بادل نہیں آتے'' اور ''مہاوٹوں کی ایک رات''، رشید جہاں کی دو کہانیاں جن میں ایک ڈراما اور ایک افسانہ شامل ہیں جن میں ''دلی کی سیر'' اور ڈراما ''پردے کے پیچھے'' اور محمود الظفر کا ایک افسانہ ''جواں مردی'' شامل ہے۔ان افسانوں میں موجودہ سماج کے رسم و رواج ،جنسی موضوع اور عورت کی ۔مظلومیت کو موضوع بنایا گیا اور باقاعدہ طور پر بغاوت کا اعلان کیا۔اس ضمن میں پروفیسر قمر رئیس یوں رقمطراز ہیں:

> ''سیاسی غلامی، بڑھتی ہوئی افلاس، بے رحم سماجی قوانین، بوسیدہ رسم و رواج اور ان کے قیود سے یہ نوجوان ایک کرب انگیز گھٹن محسوس کر رہے تھے۔اس کے خلاف ان کے وجود میں بیزاری اور نفرت کی آگ سی دہک رہی تھی۔'' ۲۸

افسانے کی تاریخ میں ۱۹۳۵ء کا سال مختصر افسانے کے لیے اہم سنگِ میل ہے،جس میں مختصر افسانے نے فنی

ارتقا میں جتنی بھی منازل طے کی ہیں اگر اُن کا جائزہ لیا جائے تو افسانہ جس کا آغاز اُردُو میں ایک ایسی صنف کی طرح ہوا جس پر فن اور اسلوب کے اعتبار سے داستان کا بڑا گہرا اثر تھا۔ سادگی اور رنگینی کی فضا سے نکل کر افسانہ ایسی راہوں سے گزرا جس پر اسے زندگی کی قربت اور فن کے احساس نے اسے نئی چیزوں سے متعارف کرایا یہاں تک کے ۱۹۳۵ء تک پہنچتے پہنچتے اس نے فن کے بہت سے مراحل طے کر کے ایسی صورت اختیار کی جس میں تکمیل فن کے سُراغ موجود ہیں۔ اس مقام پر پہنچ کر بعض افسانہ نگاروں نے ایسے افسانے لکھے جو ایک طرف تو مشرقی زندگی کی روایتوں اور فن کی نزاکتوں کی بڑی لطیف آمیزش ہے اور دوسرا اس لیے کہ ان افسانوں میں مغرب کا جو فن آہستہ آہستہ اس کے اسلوب کو متاثر کرتا اور اسے تکمیل کی راہیں دکھا تا رہا تھا جو باغیانہ انداز میں اُردُو افسانے کی روایت میں شامل ہوا۔ پہلی قسم کے افسانوں کی سب سے نمایاں مثال پریم چند کا افسانہ ''کفن'' ہے اور دوسری طرح کے افسانوں کا نمونہ ''انگارے'' کے نام سے چھپا جسے ضبط کر لیا گیا تھا۔ ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> ''دسمبر ۱۹۳۲ء میں افسانوں کی کتاب ''انگارے'' کی اشاعت ہوئی تو معنوی طور پر یہ متذکرہ بغاوت کا اعلان نامہ بھی تھا اور ترقی پسند تحریک کا نقطۂ آغاز بھی۔'' ۲۹

افسانہ ''کفن'' ترقی پسند تحریک کے آغاز سے پہلے لکھا گیا تھا اس کی اشاعت ۱۹۳۵ء میں ہوئی اس افسانے میں حقیقت نگاری نمایاں طور پر نظر آتی ہے اس کے کردار ''گھیسو'' اور ''مادھو'' استحصال سماج کی بخوبی نشاندہی کرتے ہیں جو انسانی جذبات کو نہیں سمجھتے، اور بھوک سے بلک رہے ہوتے ہیں اور ساتھ ہی ان کی کاہلی کا ذکر بھی کیا گیا ہے وہ دونوں ایسی حرکات کرتے ہیں کہ قاری کو ان پر غصہ آتا ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر وہاب اشرفی ''کفن'' پر یوں تبصرہ کرتے ہیں:

> ''پریم چند نے تو طبقاتی کشمکش اور استحصال کے بہت سارے افسانے لکھے، لیکن ''کفن'' کو افسانوی فن کا ایک لافانی نمونہ ہونا تھا اس لیے جدید اور جدید ترین فنی تقاضوں کے پس منظر میں یہ افسانہ صحیح سالم نظر آتا ہے۔ یہاں گھیسو اور مادھو استحصال کے ایسے مرحلے سے گزرے ہیں کہ آپ اپنے سے بیگانے ہوگئے ہیں۔ سماجی اور طبقاتی ناہمواریوں کے ایک طویل سلسلے کے نتیجے میں ان کے Dehumanisation کا عمل دیدنی ہے اور رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔'' ۳۰

افسانہ ''کفن'' ایک سفاک حقیقت نگاری کا بہترین نمونہ ہے جس سے زندگی کی حقیقی شکل واضح ہوتی ہے افسانہ ''کفن'' ایک طرف پریم چند کی حقیقت نگاری کو نئی سمت دیتا ہے اس میں زندگی کا گہرا مشاہدہ اور احساس کا جذبہ کارفرما ہے تو دوسری جانب ترقی پسند تحریک کو ایک مضبوط اور مستحکم بنیاد بھی فراہم کرتا ہے۔ اس ضمن میں سیّد وقار عظیم لکھتے ہیں:

''کفن زندگی کے گہرے مشاہدے اور مطالعے، تخیل اور فکر کی متوازن آمیزش اور فن کے مخلصانہ احساس کے ربط و آہنگ کا مثالی نمونہ ہے۔'' ۳۱

افسانوی مجموعہ ''کفن'' کو اُردُو ادب میں اس لیے یاد رکھا جاتا ہے کہ اس کی اشاعت نے اُردُو ادب میں ایک نئی روح پھونکی اور ترقی پسند تحریک میں اہم کردار ادا کیا۔ انگارے کی اشاعت نے اُردُو ادب میں ایک نیا موڑ لایا تھا لیکن اب بھی راستوں کی واضح نشاندہی نہیں تھی۔ ہمارے وہ نوجوان طلباء جو حصول علم کے لیے یورپ میں قیام پذیر تھے اور عالمی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں کا بغور معائنہ کر رہے تھے۔ عالمی سطح پر بھی ادیب نئی تحریک کی تلاش میں تھے۔ فاشزم کے بڑھتے ہوئے اثرات نے ساری دُنیا کے روشن خیال اور انسان دوست ادیبوں کو بیدار کرنے کا کام کیا جولائی ۱۹۳۵ء پیرس میں شہرہ آفاق شخصیات مثلاً رومن رولان، ٹامس مان اور آندر مالرو نے کلچر کے تحفظ کے لیے تمام دنیا کے ادیبوں کی ایک کانفرنس بلائی اور پہلی بار دنیا کے اہم ادیبوں نے ادب کو تحریک بنانے پر زور دینے کی غرض سے World Congress Of The Writers For The Defence Of Culture کے نام سے کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں ہندوستان کی نمائندگی سجاد ظہیر اور ملک راج آنند نے کی۔ جو کانفرنس سے نئی اُمنگ اور جوش کے ساتھ واپس لوٹے اور چند ادبی دوستوں سے مل کر لندن میں ایک جلسہ منعقد کیا، جس کا نام ہندوستانی ترقی پسند ادیبوں کی انجمن Indian Progressive Writers Association رکھا گیا اور ملک راج آنند اس کے صدر منتخب ہوئے جس کا پہلا اجلاس لندن کے ایک ریستوران میں ہوا اور اس کا منشور مرتب کیا گیا۔ پھر اپریل ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند مصنفین کا پہلا اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا جس کی صدارت منشی پریم چند نے کی اور ایک اہم خطبہ بھی دیا۔ جو ڈاکٹر انور سدید نے اپنی کتاب ''اُردُو ادب کی تحریکیں'' میں درج کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''جس ادب سے ہمارا ذوق صحیح بیدار نہ ہو، روحانی اور ذہنی تسکین نہ ملے، ہم میں قوت اور حرکت پیدا نہ ہو، ہمارا جذبہ حُسن نہ جاگے، جو ہم میں سچا ارادہ اور مشکلات پر فتح

> پانے کے لیے سچا استقلال پیدا نہ ہو، وہ آج ہمارے لیے بیکار ہے۔ اس پر ادب کا اطلاق نہیں ہوسکتا... ادب آرٹسٹ کے روحانی توازن کی ظاہر صورت ہے اور ہم آہنگی حسن کو تخلیق کرتی ہے، تخریب نہیں۔ ادب ہماری زندگی کو فطری اور آزاد بناتا ہے۔ اس کی بدولت نفس کی تہذیب ہوتی ہے یہ اس کا مقصدِ اولیٰ ہے۔''۳۲

اس تحریک کا اثر یوں تو دیگر تمام اصناف پر ہوا۔ مگر افسانے پر اس کے بہت سے اثرات مرتسم ہوئے افسانے نے تیزی سے ترقی کی منازل طے کرنا شروع کر دیں۔ ترقی پسند تحریک نے افسانے کو ایک نیا رُخ دیا ترقی پسند افسانہ نگاروں میں پریم چند، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، اختر حسین رائے پوری، راجندر سنگھ بیدی، حیات اللہ انصاری، ابراہیم جلیس، احمد علی، خواجہ احمد عباس، علی عباس حسینی، اوپندر ناتھ اشک، محمد حسن عسکری، رشید جہاں وغیر نے عمدہ اور معیاری افسانے لکھے۔

پریم چند نے اُردو افسانے کو داستانوی ماحول سے نکال کر اس کا رشتہ زندگی سے استوار کیا اور اپنے گہرے مشاہدے سے معاشرے میں حقیقت کو اُجاگر کیا اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے انسان کی عظمت اور محنت کو بھی بلند مقام عطا کیا اور ایسے افسانے تخلیق کیے، جو حقیقت پر مبنی ہیں اور انہی خصوصیات کی بنا پر انھیں پہلا ترقی پسند افسانہ نگار کہا جاتا ہے۔ ان کے مشہور افسانوں میں سے سوا سیر گیہوں، کفن، زیور کا ڈبہ وغیرہ شامل ہیں۔

کرشن چندر کی ابتدائی شہرت اور مقبولیت کا سبب اس کا رومانی طرز نگارش تھا وہ رومانی فن کار تھے۔ لیکن زیادہ دیر تک رومانی فضا میں نہیں رہے اور جلد ہی حقیقت کی طرف گامزن ہوئے چنانچہ ''طلسم خیال'' کے بعد ان کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ''نظارے'' کے نام سے شائع ہوا تو اس سے یہ ظاہر ہونے لگا کہ اِن کے زاویہ نظر میں بڑی تیزی سے تبدیلی آرہی ہے اور ''اَن داتا'' میں کرشن چندر رومان پرست کے بجائے تلخ حقیقت نگار اور انقلاب پسند کی حیثیت سے جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ بقول سیّد وقار عظیم:

> ''رومان پرست کرشن چندر حقیقت پسندانہ اور تلخ نگار انقلابی بن گیا اور اس ذہنی، جذباتی اور فکری انقلاب نے اس کے افسانوں کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا، سفید پھول، ٹوٹے ہوئے تارے اور اَن داتا اس ارتقا کی مختلف منزلوں کی مظہر ہیں۔''۳۳

کرشن چندر ترقی پسند افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام ہے جہاں تک ان کے افسانوں کا تعلق ہے ان میں دو

اہم خصوصیات پائی جاتی ہیں ایک تو ان کا اسلوب ہے اور دوسرا ان کا تجربہ اور گہرے مشاہدات ان کے افسانوں میں ملتے ہیں ۔کرشن چندر کا اسلوب اس قدر دل آویز ہوتا ہے کہ بعض اوقات ان کے اسلوب پر شاعری کا گمان ہونے لگتا ہے ان کے اسلوب میں الفاظ اپنے نغموں اور سُروں کے ساتھ اُبھرتے ہیں ۔ان کے الفاظ کا بہترین انتخاب اور اس کے مناسب استعمال سے کرشن چندر افسانے کی ایک مخصوص فضا تخلیق کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں ۔سیّد وقار عظیم لکھتے ہیں:

> ''کرشن چندر کی تحریروں کی سب سے زیادہ خصوصیت ان کا کبھی نہ تھکنے والا اور تھکانے والا انداز ہے۔اُن کے پاس ہر بات کے کہنے کا ایک ایسا طریقہ ہے جو سیدھا دل میں اثر کرتا ہے۔اس اندازِ بیان کا حسن یہ ہے کہ افسانہ نگار کو جو کچھ کہنا ہے وہ اسی انداز میں گھل مل کر ایک جان ہو گیا ہے۔''۳۴

کرشن چندر نے اُردُو افسانے کو تقریباً ۲۶ افسانوی مجموعے عطا کیے ان کی مشہور افسانوں میں ،اَن داتا، کالو بھنگی، دو فر لانگ لمبی سڑک ، زندگی کے موڑ پر، گرجن کی ایک شام ، ہم وحشی ہیں ، پشاور ایکسپریس ، جانور، پورے چاند کی رات، تین غنڈے ،ٹوٹے ہوئے تارے ،گھونگھٹ میں گوری جلے ،سمندر دور ہے ،مہالکشمی کا پل ، ایک مگر مچھ، مینا بازار ،ایک سیتا ،چابک ،مسکرانے والیاں شامل ہیں اس کے علاوہ کرشن چندر کے مشہور طنزیہ اور مزاحیہ افسانوں میں لکھ پتی بننے کا نسخہ، ملکہ کی آمد، گندہ دان، نیکی کی گولیاں ، کتا پلاننگ ، پرانا قرضہ، جامن کا درخت، باپو تیرے نام پر، شیطان کا استعفیٰ اہم افسانے ہیں۔

راجندر سنگھ بیدی اُردُو ادب کے اس دور کے اہم افسانہ نگار ہیں بیدی نے بھی کرشن چندر کی طرح رومانیت سے حقیقت نگاری کی طرف مسلسل سفر کیا۔ بیدی ایک دردمند شخصیت کے مالک تھے ان کے افسانوں میں اِنسانی دُکھوں ،محرومیوں اور پریشانیوں کو موضوع بنایا گیا ہے اور اسی دردمندی کی بدولت ان کے افسانوں پر بھی ایسی ہی فضا چھا جاتی ہے جو قاری کو اپنا ہم نوا بنا لیتی ہے راجندر سنگھ بیدی بنیادی طور پر اپنے ماحول کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں اور ان کے مسائل کا اپنی نظر سے وسیع مطالعہ کرتے ہیں ۔اس ضمن میں سیّد وقار عظیم رقمطراز ہیں:

> ''بیدی اس دور کے سب سے زیادہ جذباتی افسانہ نگار ہیں ۔اس جذباتیت نے ان کی افسانہ نگاری کی ابتدالفاظی اور منظر کشی سے کی اپنے فن کے آغاز میں افسانہ نگار قدم قدم

پر پڑھنے والے کے تحیر سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔اس کا فن جمالیاتی ذوق آسودگی کو مطمحِ نظر سمجھتا ہے۔'' ۳۵

دیکھا جائے تو بیدی نے بہت سے افسانے تخلیق کیے اور سب اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں لیکن فکری اور فنی لحاظ سے ان کے مشہور افسانے بھولا، گرہن، لاجونتی، اپنے دُکھ مجھے دے دو، گرم کوٹ، لمبی لڑکی، ٹرمینس سے پرے، صرف ایک سگریٹ عمدہ افسانے ہیں۔

پریم چند نے حقیقت نگاری کی جو داغ بیل ڈالی تھی اس کو پروان چڑھانے والوں میں علی عباس حسینی کا نام اپنی الگ شناخت رکھتا ہے۔جب ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک شروع ہوئی تو علی عباس حسینی نے اس تحریک کو خوش آمدید کہا اور اپنی حقیقت پسندی میں ترقی پسندی کی آمیزش کر کے اُردو افسانے کو ایک اہم موڑ دینے میں مددو معاون ثابت ہوئے۔انھوں نے اپنے افسانوں میں دیہات اور متوسط طبقے کے لوگوں کا بڑی خوبصورتی سے اظہار کیا ہے۔ڈاکٹر اسلم جمشید پوری لکھتے ہیں:

''علی عباس حسینی نے مزدوروں، کسانوں اور عام انسانوں کی زندگی کی سچی تصویر کشی کی ہے۔ خاص کر زمینداروں اور مزدور طبقے کے مابین معاشی رسہ کشی کو انھوں نے خوبصورت انداز میں قلم بند کیا ہے۔دیہات کی زندگی کی عکاسی ان کے افسانے مقابلہ، پاگل، انتقام، کنجی، ہار جیت میں اپنے عروج پر ملتی ہے۔'' ۳۶

علی عباس حسینی کا پہلا افسانوی مجموعہ ''پژمردہ کلیاں'' ہے انھوں نے آزادی سے قبل تک خوب لکھا اور تقریباً نو افسانوی مجموعے تخلیق کیے جن میں رفیقِ تنہائی، باسی پھول، میلہ گھومنی، آئی سی ایس، ایک حمام میں، کچھ ہنسی نہیں ہے، سیلاب کی راتیں، حسن رہ گزر اور ندیاں کنارے شامل ہیں۔

سعادت حسن منٹو ترقی پسند افسانہ نگاروں میں ایک بڑا نام ہے انھوں نے اپنے مشاہدے اور تخیل سے بہت عمدہ اور معیاری افسانے لکھے اور ان کے حق میں بہت کچھ لکھا بھی جا چکا ہے اگر چہ منٹو پر فحش نگاری کے الزامات بھی لگے لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ وہ اُردو کے اہم اور عظیم افسانہ نگار ہیں۔خلیل الرحمٰن اعظمی بھی منٹو کو ترقی پسند افسانہ نگار تسلیم کرتے ہیں۔خلیل الرحمٰن اعظمی منٹو کے یہاں در آنے والی جنسی بے رہروی اور دوسرے کمزور عناصر کی بھی نشاندہی کرتے ہیں اور یہ بھی کہنا ہے کہ منٹو کے افسانے کی خامیوں کو اگر الگ کر دیا جائے تو پھر منٹو آج بھی ترقی پسند افسانے (ادب) کے لیے بے حد کارآمد ہوسکتا ہے۔بقول خلیل الرحمٰن اعظمی:

''منٹو کے افسانوں سے کمزور عناصر اور اس کے منفی نقطہ کو علیحدہ کر کے اس کے فن سے اب بھی ترقی پسند ادب کو بہت کچھ مدد مل سکتی ہے۔'' ۳۷

سعادت حسن منٹو کے افسانوں کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ اُن کے ہاں موضوعات کا تنوع ملتا ہے جس کی بنا پر ان کے افسانوں میں یکسانیت پیدا نہیں ہوتی منٹو ایک طرف نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی جنسی اُلجھنوں اور طوائف کی زندگی جیسے موضوعات کو اپنا موضوع بناتا ہے تو دوسری طرف ان کے افسانوں میں ہندوستان کی جنگِ آزادی، تقسیم اور جدوجہد بھی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر اسلم جمشید پوری لکھتے ہیں:

''منٹو کے ترقی پسند ہونے کی دلیل میں زیادہ تر نقاد ''نیا قانون'' افسانے کو پیش کرتے ہیں اِس میں کوئی شک نہیں کہ ''نیا قانون'' منٹو کے قلم سے نکلا ہوا شاہکار افسانہ ہے۔ لیکن جہاں تک حقیقت نگاری کا تعلق ہے تو منٹو نے اس ضمن میں جو کچھ بھی تخلیق کیا وہ بے باک حقیقت نگاری کے زمرے میں رکھا جاتا ہے۔ وہ خواہ تقسیم ہند کے اثرات کا موضوع ہو، جنسی مسائل ہوں یا نفسیات۔'' ۳۸

منٹو نے بے شمار افسانے تخلیق کیے جن میں نیا قانون، ٹھنڈا گوشت، کھول دو، ٹوبہ ٹیک سنگھ، موذیل، کالی شلوار، ہتک، سرکنڈوں کے پیچھے، ہیجان اور شاردا جیسے افسانے شامل ہیں۔

ترقی پسند افسانہ نگاروں میں ایک بڑا نام احمد علی کا ہے انھوں نے اپنے افسانوں میں مٹتی ہوئی تہذیب پر بڑی جرأت سے بات کرتے ہیں ان کے ہاں حقیقت اور ماورائے حقیقت دونوں کا شعور ملتا ہے۔ ان کا انداز رمزیہ اور لب ولہجہ فلسفیانہ ہے اُن کی بہترین کہانیوں میں ہماری گلی، پریم کہانی ، مہاوٹوں کی ایک رات، بادل نہیں آتے (انگارے)، میرا کمرہ اور شعلے جیسے بہترین افسانے تخلیق کیے۔ اس ضمن میں سیّد وقار عظیم یوں رقمطراز ہیں:

''احمد علی کی افسانہ نگاری میں بھی فنی ارتقا کی مختلف منزلوں کے نشان بیحد واضح اور نمایاں ہیں ''بادل نہیں آتے'' اور ''مہاوٹوں کی ایک رات'' فن کے اس سفر کا آغاز ہے۔ اس منزل پر افسانہ نگار نے زندگی اور فن کے گہرے اور قریبی رشتے کو سب سے پہلی اور اہم ضرورت سمجھا ہے۔ شعلے کے افسانے جن میں تصویر کے دورُخ اور استاد شمّو خان، خاص کر اہم ہیں۔ زندگی اور فن کے اس رشتے کو زیادہ مضبوط بناتے ہیں۔ یہ ارتقا کی

> دوسری منزل ہے۔ تیسری منزل وہ ہے جس میں ''ہماری گلی'' اور ''میرا کمرہ'' لکھا گیا۔ اس منزل پر پہنچ کر افسانہ نگار نے زندگی کے حقائق کی نفسیاتی تاویلیں کی ہیں اور اپنے فن کو زیادہ آزادی کی طرف مائل کیا ہے۔ قید خانے کے افسانے اس سفر کی ایک نئی منزل کا سُراغ دیتے ہیں۔ یہاں زندگی نفسیاتی تخیل، فلسفیانہ فکر اور فنی جدّت و وسعت افسانہ نگار کا مطمحِ نظر ہے۔''۳۹

حیات اللہ انصاری بھی ترقی پسند افسانہ میں اہم نام ہے۔ پریم چند اور انگارے کے مصنفین سے ترغیب پا کر ترقی پسند تحریک میں شامل ہوئے حیات اللہ انصاری نے بے شمار افسانے تخلیق کیے ان کے افسانوں کی خوبی حقیقت نگاری ہے ان کی فکر، بلند خیال اور ان کو فن پر دسترس حاصل ہے، جس سے معمولی سا واقعہ بھی افسانہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ کیوں کہ ان کا مشاہدہ بہت گہرا ہے اور وہ معمولی سے معمولی اور چھوٹی چھوٹی بات کی گہرائی جاننے میں کامیاب ہوتے دکھائی دیتے ہیں اور ان کو رنگینی، گہرائی اور معنویت عطا کرتے ہیں۔ بقول وقار عظیم:

> ''ان کے افسانوں میں مشاہدہ، تخیل اور فکر تینوں کی برابر جگہ ہے ان میں سے صرف ایک چیز کے سہارے پر چلنا انھوں نے نہیں سیکھا، جہاں مشاہدہ ہے وہاں تخیل بھی ہے اور فکر بھی، ان کا کوئی افسانہ ان تینوں چیزوں کی مدد کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتا، اپنے فن کے ساتھ اس درجہ انہماک اور خلوص کی مثال ہمیں اُردُو کے افسانہ نگاروں میں حیات اللہ انصاری سے زیادہ کہیں اور نہیں ملتی۔''۴۰

حیات اللہ انصاری کے تخلیق کیے ہوئے افسانوں میں ''بڈھا سود خوار'' یہ ان کا پہلا افسانہ تھا۔ اور آخری کوشش، انوکھی مصیبت، ڈھائی سیر آٹا، پرواز، کمزور پودا، ادا یا قضا، شکستہ کنگورے، خلوص، بھرے بازار میں، اور موضوع کے تنوع کے اعتبار سے ''موزوں کا کارخانہ'' اور ''بہت ہی باعزت'' ان کے اہم افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی کا شمار اُردُو ادب میں ان ادبا اور شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے افسانہ اور شاعری میں یکساں مقبولیت حاصل کی احمد ندیم قاسمی بیک وقت شاعر بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی انھوں نے دونوں اصناف میں اپنا لوہا منوایا انھوں نے سماجی حقیقیت نگاری کے لیے دیہی اور شہری دونوں طرح کی معاشرت کو چنا ہے اور دیہات کی زندگی کی بہترین عکاسی کی ہے ان کے افسانوں میں پنجاب کا دیہات صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ پنجاب کے دیہات کے

مسائل کو کہانی کا روپ دینے کا اعزاز انہی کے سر ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی کا خیال ہے کہ:

''احمد ندیم قاسمی پنجاب کی زندگی کے عکاس بن کر اُبھرے۔ چوپال اور بگولے ایسے افسانوی مجموعے ہیں جن میں پنجابی زندگی کے خدوخال اُبھر آئے ہیں۔''[۴۱]

ان کے چند نمائندہ افسانوں میں چوپال، بابا نور، بین، سناٹا، بازارِ حیات، نیلا پتھر، تسکین، پرمیشر سنگھ اور میں انسان ہوں شامل ہیں۔ ان کے افسانوں پر ڈاکٹر اسلم جمشید پوری یُوں تبصرہ کرتے ہیں:

''احمد ندیم قاسمی نے ۱۹۳۶ء کے بعد سے ہی چھپنا شروع کر دیا تھا۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''چوپال'' ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۴۱ء میں بگولے، ۱۹۴۲ء میں طلوع وغروب، ۱۹۴۳ء میں گرداب، ۱۹۴۴ء میں سیلاب، ۱۹۴۵ء میں آنچل، ۱۹۴۶ء میں آبلے، ۱۹۴۹ء میں در و دیوار، ۱۹۵۱ء میں بازارِ حیات، ۱۹۶۴ء میں برگِ حنا، ۱۹۶۷ء میں گھر سے گھر تک، ۱۹۷۴ء میں کپاس کا پھول، ۱۹۸۰ء میں نیلا پتھر، اس کے علاوہ دھڑکنیں، پت جھڑ اور آس پاس، ۱۹۸۰ء کے بعد شائع ہوئے۔''[۴۲]

خواجہ احمد عباس ایک ایسا افسانہ نگار ہے جو صرف ترقی پسند نظریات کی روشنی میں زندگی تعبیر کرتا ہے اور ایسے نظریات ہیں جن میں بے پناہ سامراج دشمنی، سماجی اور اقتصادی مساواتِ انسانی کا واضح تصور اور ہندوستانی عوام کے آپس میں بھائی چارہ دیکھنے میں ملتے ہیں ان کے افسانوں میں زیادہ تر یہی ملتا ہے۔ ایک مشہور کہانی کار رتن سنگھ کا خیال ہے کہ:

''خواجہ احمد عباس بحیثیت ادیب اور کہانی کار اُس کسان جیسا ہی ہے۔ جو غریبوں کا یار و مددگار ہے۔ جو غریبوں کے بدن پر لگی ہوئی مٹی کو جھاڑ کر اُن کے اُجلے تن پر خوشحالی کے نئے کپڑے پہنانے کا خواب دیکھ رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ان کے من پر سے پسماندگی کی میل اتر جائے اور زندگی کی نئی قدریں ان کے وجود میں شمع کی لو بن کر دمک اُٹھیں، چمک اُٹھیں۔''[۴۳]

ان کے افسانوں میں سماجی مسائل اور سیاسی الجھنوں کو اہمیت حاصل ہے اس کے افسانوں کے کردار حقیقی

ہونے کے باوجود غیر فطری نظر آتے ہیں ان کے تخلیق کیے ہوئے افسانوں میں بارہ گھنٹے، لال اور پیلا ،ٹڈی، ابابیل، سردار جی، شکراللہ کا، سونے کی چار چوڑیاں، بھولی، پہیّہ، روپے آنے پائی، دیا جلے ساری رات، زعفران کے پھول ان کے عمدہ اور معیاری افسانے ہیں۔

اُردُو افسانے کی تاریخ میں **عصمت چغتائی** کا نام بہت اہم ہے عصمت چغتائی اُردُو کی پہلی بے باک خاتون افسانہ نگار ہیں جنھوں نے اپنے افسانوں میں جنسیت کو مبالغہ آمیز انداز میں پیش کیا ان کے افسانے سماج کے اعلیٰ طبقے میں ہونے والے واقعات و حادثات کے بہترین ترجمان ہیں۔انھوں نے سماج کی ڈری، بے بس اور سہمی عورت کو نہ صرف بولنا سکھایا بل کہ جنسی موضوعات پر سوچنے سمجھنے کا حوصلہ بھی دیا۔عصمت چغتائی کی افسانہ نگاری پر وقار عظیم یوں رقمطراز ہیں:

> ''حق کے اظہار کے لیے اُنھوں نے بہت سے لطیف اور شدید حربوں سے کام لیا ہے۔ تیکھے طنز، چست فقرے، شکر میں لپٹی ہوئی کڑوی باتیں، ہنسی مذاق اور اسی ہنسی مذاق میں ہجوِ ملیح، پھبتیاں، باتوں کی چٹکیاں، ہنس ہنس کر سب کچھ کہہ جانا، یہ سب سیدھی سادی روزمرہ کی باتیں، ان کے فن کے تھوڑے سے حربے ہیں۔'' ۴۴؎

عصمت چغتائی کے افسانوں میں عام گھرانوں کی، ان کی عورتوں اور بچوں کی نفسیاتی و جنسی الجھنوں کو بڑی بے باکی سے موضوع بنایا دراصل اُن کے آس پاس جو ماحول تھا انھوں نے اپنے گہرے مشاہدے اور فنی چابکدستی کے ذریعے حرفوں، لفظوں اور جملوں کا بہترین استعمال کر کے پیش کیا۔اس ضمن میں فضیل جعفری اس خیال کی تصدیق کرتے ہیں:

> ''عصمت نے اپنے افسانوں میں جو ماحول پیش کیا ہے وہ یہی ہے جو اُن کا اپنا ماحول رہا ہے۔اور جس کی حقیقی عکاسی کے لیے وہ مشہور ہیں۔یعنی ایسا متوسط یا غریب متوسط مشترکہ خاندان جہاں عموماً دولت، علمیت یا افرادِ خاندان کی غیر معمولی صلاحیتوں کی فراوانی کے بجائے گھریلو محبتوں اور عداوتوں، معاشی بدحالی، بے ضرر گالیوں، جائز اور ناجائز بچوں کی فراوانی پائی جاتی ہے۔'' ۴۵؎

عصمت چغتائی نے بھی آزادی سے قبل لکھنا شروع کیا، لیکن آزادی کے بعد زیادہ لکھا ان کے تخلیق کیے ہوئے افسانوں میں لحاف، چوتھی کا جوڑا، بچھو پھوپھی، بہو بیٹیاں، ساس، پردے کے پیچھے، ضدی، کینڈل کورٹ،

خدمت گار شامل ہیں۔

متذکرہ بالا افسانہ نگاروں کے علاوہ پاکستان میں انتظار حسین، غلام عباس، ممتاز مفتی، آغا بابر وغیرہ اور ہندوستان میں اختر اورینوی، انور عظیم، رام لعل، شکیلہ اختر، قاضی عبدالستار وغیرہ کے یہاں ترقی پسند اثرات پائے جاتے ہیں۔اس ضمن میں انور سدید یوں رقمطراز ہیں:

''اِن افسانہ نگاروں نے زندگی کو غیر جانب داری سے دیکھا اور نظریاتی انتہا پسندی کا شکار ہوئے بغیر اسے تخلیقی رعنائی سے موضوع بنایا،ان کے افسانوں میں حقیقت اور تخیل کا امتزاج عمل میں آیا اور انھوں نے زندہ رہنے والے افسانے لکھے۔ترقی پسند افسانے کا دورِ عروج انہیں افسانہ نگاروں سے عبارت ہے اور ان کی عظمت سے انکار ممکن نہیں۔''۴۶

ترقی پسند تحریک کے بارے میں مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ آزادی کے بعد ان کی آواز آہستہ آہستہ ماند پڑتی گئی، پریم چند، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، علی عباس حسینی، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری، احمد ندیم قاسمی وغیرہ نے ترقی پسند افسانے کو نئی روح عطا کی اور آزادی کے تقریباً پانچ برسوں تک ترقی پسند افسانہ اپنے عروج پر تھا اور آزادی کے آٹھ برسوں بعد یعنی ۱۹۵۵ء کے آس پاس اس تحریک کا زور ٹوٹنے لگا اس کا سبب یہ تھا کہ مقصدیت میں شدت آ گئی اور خارجی عوامل کا اثر ختم ہونے لگا اور داخلیت کا سفر شروع ہو گیا۔اور ۱۹۶۰ء میں اس تحریک کی مقبولیت پر جدیدیت نے قبضہ جما لیا اور ترقی پسند تحریک کے زوال اور جدیدیت کے عروج کا سال ۱۹۶۰ء ہی ہے۔ترقی پسند تحریک کے اثرات اب بھی ہیں لیکن اس تحریک کا زور ختم ہو گیا ہے آج بھی نئی نوجوان نسل میں اس کے عناصر دکھائی دیتے ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ کوئی بھی تحریک ختم نہیں ہوتی، اس کے مثبت رویے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ڈاکٹر سلیم اختر کہتے ہیں:

''ترقی پسند ادب کی تحریک نے اگرچہ کچھ بھی نہ کیا ہوتا تو اس کے زیرِ اثر جس طرح سے افسانہ میں حقیقت نگاری اور واقعیت نگاری نے فروغ پایا اور پھر ان کے نتیجے میں اُردُو افسانے نے جس طرح پہلی مرتبہ معاشرے کو محدّب شیشہ میں رکھ کر اس کی گندگی، کجی اور تضادات کو اُجاگر کیا اس نے اُردُو افسانے کے تنِ مردہ میں روح پھونک دی اس حد تک کہ اس وقت کا جدید افسانہ ترقی پسند افسانہ کہلایا۔''۴۷

رومانوی افسانہ نگار:

رومانوی افسانہ نگاروں کا تعین کرنے سے پہلے ہم رومانوی تحریک کو زیر بحث لائیں گے۔رومانوی تحریک کو عام طور پر سرسید احمد خان کی تحریک کا ردِعمل قرار دیا جاتا ہے کیوں کہ سرسید کی تحریک کا مقصد اصلاحی تھا۔یہ تہذیب الاخلاق کا دور تھا جس کی نثر عقلیت،منطق و استدلال اور معنویت سے بوجھل تھی مزید یہ کہ تہذیب الاخلاق کا ادب اخلاقی، مذہبی، تہذیبی اور تمدنی اقدار سے بھرا ہوا تھا۔اس جذبے اور احساس کے خلاف رومانی نوعیت کا ردِعمل شروع ہوا اور جذبہ تخیل کی وہ رو جسے علی گڑھ تحریک نے روکنے کی کوشش کی تھی وہ اُبھرے بغیر نہ رہ سکی۔

اگر چہ اُردُو ادب میں رومانیت کی ابتدا انیسویں صدی کے آخری حصے میں ہو چکی تھی تاہم اسے حقیقی فروغ بیسویں صدی میں پہلی جنگِ عظیم کے بعد حاصل ہوا۔اُردُو میں اس کا آغاز بنیادی طور پر سرسید تحریک کے ردِعمل کے طور پر ہوا سرسید نے عقلیت ، مادیت اور حقائق نگاری پر بہت زیادہ زور دیا لیکن زندگی کے جذباتی اور رومانی پہلو کو یکسر نظر انداز کر دیا۔کچھ عرصہ تک یہی سلسلہ چلتا رہا لیکن آخر کار سرسید کی عقلی اور مقصدی ادب کے خلاف رومانوی ادیبوں نے شدید احتجاج کیا۔جذباتی سطح پر اس ردِعمل کو مثبت صورت میں محمد حسین آزاد، میر ناصر علی اور عبدالحلیم شرر نے اُبھارہ اور ان اسالیب کو فروغ دینے کی کوشش کی جن میں تخیل و جذبے کو اہمیت حاصل ہو۔آزاد نے نیرنگِ خیال میں ایسی رنگین پناگاہیں تخلیق کیں جنہیں صرف وجدان کی داخلی نگاہ سے دیکھا جا سکتا ہے میر ناصر علی نے تہذیب الاخلاق کے مقابلے میں فسانہ ایام، صلائے عام جیسے رسائل جاری کیے جس میں زبان کی خوبی کو خیال کی خوبی پر ترجیع دینے کی کوشش کی اور جذبہ و تخیل کو نمایاں کیا اور ادب کا رُخ رومانیت کی طرف موڑ دیا اس طرح شعر و ادب کی دُنیا میں نئی جہتوں کی نشاندہی ہوئی۔اُس وقت کے حالات اور مغربی علوم کی آمد نے اس تحریک کو پھلنے پھولنے اور مقبولیت حاصل کرنے میں مزید مدد دی ایک طرح سے اُردُو افسانے کا آغاز ہی رومانیت سے ہوتا ہے۔اس ضمن میں ڈاکٹر محمد عالم خان لکھتے ہیں:

> ''اُردُو افسانہ نگاری کی تاریخ میں رومانوی افسانہ بنیادی اہمیت کا حامل رہا ہے رومانیت ہمارے ہاں لکھے گئے افسانے کا باقاعدہ نقطۂ آغاز قرار پاتی ہے اگر چہ اس سے قبل بھی داستانی ادب اور نثر لطیف میں رومانی رجحان کی جھلک ملتی ہے مگر باقاعدہ اُردُو افسانہ جب ادب کا حصہ بنا تو اس کی پہلی صورت اور خدوخال مکمل طور پر رومانی تھے۔''[۴۸]

اُردُو افسانے میں زیادہ تر دو، رجحانات ہی غالب رہے ہیں ایک رومانی اور دوسرا ترقی پسند۔ترقی پسند یا

حقیقت پسند رجحان کی طرح رومانوی بھی ایک مضبوط رجحان ہے جس کا اثر ہر عہد کے افسانے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ رومانوی افسانہ چاہے جیسا بھی ہو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُردُو میں افسانے کی ابتدا کا سہرا رومانیت پسندوں کے سر جاتا ہے رومانوی ادیبوں میں سجاد حیدر یلدرم ایک اہم نام ہے یلدرم نے اُردُوافسانوں میں پہلی مرتبہ ایرانی اور ترکی افسانوں کو جگہ دی ان زبانوں کے افسانوں کا خوبصورت ادبی ترجمہ کیا یلدرم اُردُو کے پہلے افسانہ نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں اور ان کے افسانوں میں رومانیت نمایاں ہے ان کی رومانیت میں جذبے کی سادگی اور سچائی نظر آتی ہے۔اس ضمن میں ڈاکٹر محمد عالم خان رقمطراز ہیں:

''افسانوی ادب کی تاریخ میں رومانی افسانہ اس اعتبار سے انتہائی اہم مقام رکھتا ہے کہ اس کی بدولت افسانہ نگاری کا فن نہ صرف مقبول ہوا بلکہ ترقی کے مدارج طے کرنے کے قابل ہوا۔ رومانوی افسانے کا تعلق چونکہ جذباتیت سے بھی تھا چناچہ اسے اسی شدت سے چاہا بھی گیا، جس شدت سے اس میں جذباتی وفور کے دریا بہہ رہے تھے اسے لکھا بھی جذباتی وفور کے ساتھ گیا۔اور جہاں تخلیق کی تہہ میں جذباتی وفور کارفرما ہوں وہاں آگے کا سفر تیز تر ہو جاتا ہے۔ اگر چہ اس تخلیقی سفر میں حقیقت نگاری کی لہر بھی ساتھ ساتھ چل رہی تھی لیکن بنیادی اور مرکزی دھارا داخلی جذبات پر بھی مبنی تھا۔''[۴۹]

رومانوی افسانہ میں سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، حجاب امتیاز علی، مجنوں گورکھ پوری وغیرہ اہم افسانہ نگار ہیں۔

سجاد حیدر یلدرم کے ہاں رومانیت پوری آب وتاب سے جلوہ گر ہے ان کی رومانیت متحرک رومانیت ہے جو انسان میں زندہ رہنے کی قوت اُبھارتی ہے ان کے نزدیک زندگی میں صرف محبت ایک ایسا عنصر ہے جو افسانے جیسی صنف کا ہی موضوع بن سکتا ہے ان کے خیال میں کسی بھی ادیب کو زندگی کے ان جھگڑوں سے کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہیے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی تحریروں کو عورت اور فطرت کے حسن اور ان دونوں کے فطری رومان کے لیے وقف کر دیا تھا۔ یلدرم محبت کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں چاہتے۔انھوں نے اپنے افسانوں میں عورت اور محبت کے موضوع اور مضمون پر بڑی رغبت اور کثرت سے اظہار کیا کیوں کہ ان کا مزاج ہی رومان پسند تھا اور وہ افسانے میں رومانی تحریک کے بانی تھے۔

ان کے چند نمائندہ افسانوں میں ازدواجِ محبت، مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ، صحبت ناجنس، چڑیا چڑے

کی کہانی، نکاح ثانی، نشے کی پہلی ترنگ، گلستان، حضرت دل کی سوانح عمری، غربت و وطن، دوست کا خط، جواب وغیرہ جیسے افسانے تخلیق کر کے انھوں نے اپنا لوہا منوایا۔

نیاز فتح پوری طبعاً رومان پسند تھے ان کی تحریروں میں رومانیت کا غلبہ ملتا ہے ان کے افسانے اس دور کی تخلیق ہیں، جس میں عورت، حسن اور رومانی اندازِ فکر کو بنیادی اہمیت حاصل تھی ان کے ابتدائی افسانے حسن وعشق کے طرزِ خیال کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں اُن کا نام سجاد حیدر یلدرم کے ساتھ لیا جاتا ہے کیوں کہ اس کے افسانے رومانی فضا سے بھرے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

> ''نیاز اُردو افسانے کے بانیوں میں ہیں اور ان کا نام بجا طور پر پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم کے ساتھ لیا جاتا ہے لیکن نیاز کے ابتدائی افسانے خالص رومانی اور تاثراتی انداز کے ہیں، بعد کو انھوں نے مذہبی ریا کاری اور مولویانہ ذہنیت کی تنگ نظری کو خصوصاً موضوع گفتگو بنایا اور اُن سے سماجی اصلاح کا کام لیا بعد کو ان کے افسانوں میں اصلاحی رجحان روز بروز واضح ہوتا گیا۔'' ۵۰

نیاز فتح پوری کے افسانوی مجموعے: نگارستان، جمالستان، نقاب اُٹھ جانے کے بعد، ایک پارسی دوشیزہ کو دیکھ کر، حُسن کی عیاریاں اور دوسرے افسانے مختارات نیاز، شہاب کی سرگذشت، ایک شاعر کا انجام، ان کے افسانوں میں شہیدِ آزادی، درسِ محبت، دو خط، دنیا کا اولین بت ساز، دو گھنٹے، جہنم میں، محبت کی دیوی، زہرہ کا ایک پجاری شامل ہیں۔ ان کے افسانوں کے متعلق ڈاکٹر فرمان فتح پوری کہتے ہیں:

> ''نیاز نے پہلا افسانہ ''ایک پارسی دوشیزہ کو دیکھ کر'' ۱۹۱۰ء میں لکھا، یہ افسانہ جنوری ۱۹۱۳ء کے ''نقاد'' اور ''تمدن'' میں شائع ہو۔ خود نیاز صاحب نے متعدد جگہ لکھا ہے کہ ''یہ افسانہ ۱۹۱۰ء کی نمائش الہ آباد کے ایک منظر سے متاثر ہو کر اسی زمانہ میں قلمبند کیا گیا ہے اور یہی میرا پہلا افسانہ ہے۔'' ۵۱

اسی طرح **مجنوں گورکھ پوری** نے نیاز فتح پوری کے زیراثر افسانہ نگاری شروع کی۔ انھوں نے اپنا افسانہ ''زیدی کا حشر'' جو کہ نیاز فتح پوری کے مشہور افسانہ ''شہاب کی سرگذشت'' سے متاثر ہو کر لکھا۔ ان کے افسانوں میں رومانیت کی تصویر کے ساتھ ساتھ جذبے کی جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ ''ان کے نزدیک محبت ناکامی کا دوسرا

نام ہے جس کی سزا اور پاداش سوائے گھٹ گھٹ کے مرنے کے اور کچھ نہیں۔ اسی سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری یوں رقمطراز ہیں:

> ''پروفیسر احتشام حسین نے نگار پاکستان کے ''اصناف ادب'' نمبر میں اُردو افسانے پر گفتگو کرتے ہوئے مجنوں کے بارے میں لکھا ہے کہ ''وہ دنیا سے اچھے خاصے قریب ہیں لیکن آپ ان کا مطالعہ کیجیے گا تو معلوم ہوگا کہ وہ صرف محبت کو مرکزی موضوع قرار دیتے ہیں۔ محبت میں جو غم اور تلخی ہے، گھٹن اور ناکامی ہے، وہ اُن کا بنیادی موضوع ہے۔ اُن کے افسانے کسی طرح بھی آج کی فضا میں عام مسائل سے ہم آہنگ نہیں معلوم ہوتے، لیکن اُس وقت کسی نہ کسی حد تک یہ صورت ضرور تھی کہ گھروں کے اندر لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے، خون تھوکتے تھے۔ اور دِق کا شکار ہوتے تھے اور اُن کو سوائے اس کے اور کوئی راستہ دکھائی نہ دیتا تھا کہ وہ اپنے غم کو چھپائے ہوئے دنیا سے گزر جائیں۔'' ۵۲

ان کے نمائندہ افسانوں میں گہنا، زیدی کا حشر، تم میرے ہو، محبت کا جوگ، سبز پری، بڑھاپا، جشن عروسی، سمن پوش ان کے معیاری اور عمدہ افسانے ہیں۔ ان کے افسانے جذباتی سپردگی کے آئینہ دار ہیں جنھوں نے اُردو افسانہ نگاری پر بڑا اثر ڈالا ہے۔

حجاب امتیاز علی بھی رومانوی افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام ہے ان کے افسانوں کی فضا مصنوعی نہیں بل کہ سچی ہے انھوں نے اپنی دنیا خود وضع کی ہے ان کی تحریروں میں جذبات کی فراوانی اور حسن معصوم کی دلکشی ملتی ہے ان کے ابتدائی افسانے ''تہذیب نسواں'' ہی میں شائع ہوتے رہے ہیں انھوں نے لاش اور دوسرے ہیبتناک افسانے، صنوبر کے سائے، نغمات محبت، میری ناتمام محبت، خلوت کی انجمن، ادب زریں، ممی خانہ، ظالم محبت، اندھیرا خواب، تحفے اور شگوفے، کونٹ الیاس کی موت، مہمان داری، بیمار غم، یاد رفتگاں، محبت اور ہلاکت، جنازہ، وہ طریقہ تو بتا دو تمھیں چاہیں کیونکر، وہ قدیم اُداس رات، ہم جنس باہم جنس، احتیاط عشق، اس کا ایک ہاتھ کٹا ہوا تھا، جیسے عمدہ افسانے تخلیق کیے۔

اُردو افسانے کے اس دور میں سجاد حیدر یلدرم ''خارستان وگلستان''، سلطان حیدر جوش ''طوقِ آدم''، نیاز فتح پوری ''کیوپڈ سائیکی''، مجنوں گورکھ پوری ''سمن پوش''، ل۔ احمد ''بھینٹ''، محمد علی رودلوی ''تیسری جنس'' ملتے ہیں۔ سجاد حیدر یلدرم رومانیت پسند افسانہ نگار ہیں، مجنوں گورکھ پوری اور نیاز فتح پوری کے افسانوں کا موضوع عشق و

محبت کا جذباتی پہلو ہے اور ساتھ ہی ان کے افسانوں میں جذباتیت کا غلبہ ہے۔رومانوی افسانہ میں عورت کے حسن اورعشق ومحبت کے علاوہ دیگر موضوع پر بھی قلم اُٹھایا جاتا تھا اور جذباتی عنصر کارفرما تھا۔ڈاکٹر محمد عالم خان لکھتے ہیں:

''رومانی افسانے کا تعلق محض انسانی زندگی کے نشاطیہ پہلو سے ہی نہیں بلکہ سماجی اور معاشرتی حقیقتوں سے وابستہ حزن ویاست، رنج وملال، شکست ومحرومی اور افسردگی بھی رومانی افسانے کے موضوعات اور فضا کا حصہ رہے ہیں۔''۵۳؎

قیام پاکستان کے بعد کے افسانہ نگار:

قیام پاکستان کے بعد جو افسانہ نگار سامنے آئے ان میں غلام عباس ان کے مشہور افسانے آنندی، اوور کوٹ، کتبہ، یہ پری چہرہ لوگ، بہروپیا، جواری، اس کی بیوی، حمام میں، فینسی ہیئر کٹنگ سیلون، گوندنی، سمجھوتہ، سایہ، سیاہ وسفید، ہمسائے، بامبے والا، سرخ گلاب، تِلی بائی بھنور، غازی مرد، مجسمہ، بحران، چکر بندر والا، ناک کاٹنے والا، تنکے کا سہارا، اندھیرے میں، دوتماشے، ایک دردمند دل، فرار، سرخ جلوس، شامل ہیں۔اُردو کی ممتاز ترین خاتون فکشن رائٹر''آگ کا دریا'' کے علاوہ متعدد ناول، افسانے اور سوانحی کتابوں کی مصنف۔پدم شری اور گیان پیٹھ اعزاز سے سرفراز **قرۃالعین حیدر** ان کے افسانوں میں آوارہ گردی، پت جھڑ کی آواز، یہ غازی تیرے پراسرار بندے، پالی ہل کی ایک رات، نظارہ درمیان ہے، ستاروں سے آگے، روشنی کی رفتار، ایک مکالمہ، پرواز کے بعد، سنا ہے عالم بالا میں کوئی کیمیا گر تھا، مونالیزا، اودھ کی شام، قلندر، رقص شرر، کارمن، ہم لوگ، جہاں کارواں ٹھہرا تھا، جلاوطن، آسمان بھی ہے ستم ایجاد کیا، فوٹو گرافر، ٹوٹتے تارے، میں نے لاکھوں کے بول سہے، یہ باتیں، برف باری سے پہلے، ملفوظات حاجی گل بابا بیکتاشی، ڈالن والی، لگڑ بگے کی ہنسی، شامل ہیں۔مقبول ترین پاکستانی ناول نگار اور افسانہ نگار۔اپنے سفرنامۂ حج ''لبیک'' کے لیے مشہور **ممتاز مفتی** اِن کے افسانوں میں آپا، سمے کا بندھن، چپ، دومونہی، سندرتا کا راکش، پرانی شراب نئی بوتل، روغنی پتلے، نئی بوتل، وقار محل کا سایہ، جھکی جھکی آنکھیں، احسان علی، نفرت، آدھے چہرے، کھل بندھنا، بیگانگی شامل ہیں۔ممتاز ترین فکشن رائیٹر، اپنے منفرد حکایتی اسلوب اور تقسیم کے تجربے کے تخلیقی بیان کے لیے معروف۔مین بکر پرائز کے لیے شارٹ لسٹ کیے جانے والے پہلے اُردو ادیب **انتظار حسین** اِن کے افسانوں میں آخری آدمی، زرد کتا، شہر افسوس، ہمسفر، بادل، مورنامہ، اجنبی پرندے، پسماندگان، روپ نگر کی سواریاں، اپنی آگ کی طرف، دوسرا گناہ، ہڈیوں کا ڈھانچ، کشتی، محل والے، مردہ راکھ، وہ اور میں، خواب اور تقدیر، انتظار، سیڑھیاں،

پرچھائیں،مشکوک لوگ، پتے، دوسرا راستہ، پچھتاوا، لمبا قصہ، یاں آگے دور تھا وغیرہ افسانے شامل ہیں۔ہاجرہ مسرور پاکستان کی ممتاز فیمنسٹ افسانہ نگار، زندگی بھر مرد سماج کو گھیرنے والی کہانیاں لکھتی رہیں اِن کے افسانوں میں چاند کی دوسری طرف،صندوقچہ،عورت،محبت اور، ہائے اللہ، فاصلے،معصوم محبت، بے چاری،تیسری منزل،ایک بچی، بندر کا گھاؤ،کنیز،سند باد جہازی کا نیا سفر،نیلم شامل ہیں۔ممتاز پاکستانی فکشن نویس اپنی کہانی ''گڈریا'' کے لیے مشہور **اشفاق احمد** کے افسانوں میں گڈریا،ترقی کا ابلیسی ناچ،امی،سفر درسفر، پنجاب کا دوپٹہ، بابا کی تعریف، پانی کی لڑائی اور سندیلے کی طوائفیں شامل ہیں۔اے حمید مقبول افسانہ نویس اور ڈرامہ نگار، رومانی انداز کی تحریروں کے لیے جانے جاتے ہیں اِن کے افسانوں میں مٹی کی مونا لیزا، ایک رات، منزل منزل، اور پل ٹوٹ گیا،شاہدرے کی ایک شام شامل ہیں۔**واجدہ تبسم** تانیثی خیالات کی حامل ممتاز اور اُردُو فکشن رائیٹر اور شاعرہ،سماج میں عورت کی جنسی،نفسیاتی اور سماجی مسائل کو پیش کرنے کے لیے معروف۔کئی کہانیوں پر فلمیں بھی بنائی گئیں اِن کے افسانوں میں منزل، اے رود موسیٰ،شعلے،اترن، ذرا ہور اوپر، جنتی جوڑا، کوئلہ بھئی نہ راکھ، زکوٰۃ، دھنک کے رنگ نہیں ہوتے شامل ہیں۔ممتاز ترقی پسند فکشن نویس **بلونت سنگھ** کے افسانوں میں کالی تتری، بابا مہنگا سنگھ، باندھ، آبشار، جگا، تیسرا سگریٹ، کالے داس، پہلا پتھر،تعویذ،علی! علی!، لمحے،سزا، پیپر ویٹ، راستہ چلتی عورت، تین باتیں، دودھ بھری گلیاں، کٹھن ڈگریاں، ہندوستان ہمارا، گمراہ،سورما سنگھ، گرنتھی، دیش بھگت شامل ہیں۔اسی کے ساتھ ساتھ ''تسنیم نسیم چھتاروی''، ''محمود فاروق''، ''رام لعل''، ''ابوسعید قریشی''، ''مرزا ادیب''، ''آثم میرزا''، ''صادق حسین''، ''نعیم صدیقی''، ''آغا بابر''، ''انور جیلانی بانو''، ''منظر حسین''، ''م۔نسیم''، ''ابوالخطیب''، ابوالفضل صدیقی''، ''قیصر قصری''، ''حسان کلیمی''، کے نام نمایاں ہیں ان میں سے بعض افسانہ نگاروں نے تقسیم ملک سے قبل ہی افسانہ نگاری کا آغاز کر دیا تھا اس کے بعد نے شمار افسانہ نگار سامنے آئے،جس سے اُردُو میں صنفِ افسانہ کو بڑی تیزی سے مقبولیت ملی اور اسی بنا پر افسانے کے موضوعات میں زیادہ وسعت اور تنوع پیدا ہوا۔آج کے دور میں افسانہ فن کی انتہائی بلندیوں تک پہنچ چکا ہے۔

اس کے علاوہ دورِ جدید کے کے افسانوں میں علامتی رنگ نمایاں ہے۔قریب کے زمانے میں شمس آغا، رفیق حسین، قاسم محمود،عنایت اللہ، جوگندر پال، رام لعل، غلام الثقلین نقوی، یونس جاوید، الطاف فاطمہ،سلیم اختر، بلراج کومل، مسعود مفتی،حمید کاشمیری، صلاح الدین اکبر، انور سجاد، کمار پاشی، بانو قدسیہ،فرخندہ لودھی، میرزا ریاض،عضرا بخاری،نوید انجم، رخسانہ صولت،غیاث الدین گدی، اعجاز بٹ، رشید امجد، ذکاء الرحمٰن، قیوم راہی،حمیدہ رضوی،نگہت مرزا، مسعود اشعر، رفعت، محمد منشا یاد، ڈاکٹر احسن فاروقی،مظہر الاسلام، اکرم اللہ،مسرت لغاری، اُم عمارہ، خان فضل الرحمٰن اور مرزا حامد بیگ نے بلند پایہ، معیاری اور عمدہ افسانے لکھ کر صنفِ افسانہ کو زندہ کیا۔

ان افسانہ نگاروں نے فن کی روایت کو نہ صرف زندہ رکھا بل کہ اس میں اپنی اپنی شخصیتوں کا رنگ بھر کر افسانہ کو کوئی نہ کوئی ایسی چیز بھی دی ہے جو اس کی روایت کو زیادہ اہم اور زیادہ رنگین بنا رہی ہے زندگی کی اہمیت اور فن کی رنگینی اس روایت کی سب سے بڑی خصوصیت ہے، ایک ایسی خصوصیت جس نے ایک پل بھی اپنا دامن افسانے کے دامن سے جُدا نہیں کیا۔

افسانے نے ترقی کرتے کرتے بہت سی شکلیں تبدیل کی ہیں اور بہت سے ایسے افسانہ نگار ہیں جنھوں نے اپنے اپنے طرز سے اس کو برتا ان کا ایک چھوٹا سا خاکہ پیش کیا جاتا ہے:

ترقی پسند:

منشی پریم چند، راجندر سنگھ بیدی، ڈاکٹر رشید جہاں، مجنوں گورکھ پوری،
بلونت سنگھ، کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک، حیات اللہ انصاری،
سعادت حسن منٹو، عزیز احمد، خواجہ احمد عباس، شوکت صدیقی،
عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر

رومانیت:

سجاد حیدر یلدرم، مرزا ادیب، قدرت اللہ شہاب، اشفاق احمد،
حجاب امتیاز علی، اے حمید، شفیق الرحمٰن

حلقۂ اربابِ ذوق:

ممتاز مفتی، محمد حسن عسکری، ممتاز شیریں، آغا بابر،
غلام الثقلین نقوی، عاشق حسین بٹالوی

علامت نگاری وجدیدیت:

انتظار حسین، ڈاکٹر انور سجاد، رشید امجد، خالدہ حسین،
اسد محمد خان ،مظہر الاسلام، احمد ہمیش، احمد جاوید،
مظہر الزمان خان

عصری افسانہ:

ابوالفضل صدیقی،	عبداللہ حسین،	خدیجہ مستور،	نیاز فتح پوری،
احمد ندیم قاسمی،	غلام عباس،	ڈاکٹر شائستہ اکرام اللہ،	بانو قدسیہ،
اقبال خورشید،	قدرت اللہ شہاب،	جیلانی بانو،	مستنصر حسین تارڑ،
مسعود اشعر،	نیر مسعود،	مرزا حامد اللہ بیگ،	زاہدہ حنا،
عرش صدیقی،	رضیہ فصیح احمد،	انیس ناگی،	ڈاکٹر سلیم اختر،
فہمیدہ ریاض،	محمد حمید شاہد،	ڈاکٹر آغا سہیل،	محمد منشا یاد،
ڈاکٹر محمد باقر	،محمد خالد اختر	،احمد داؤد،	ہاجرہ مسرور،
گلزار،	آصف فرخی،	جلیل قدوائی،	سید محمد اشرف

اصلاحی:

اقبال خورشید، اقبال اسلم، ڈپٹی نذیر احمد، اشفاق احمد،
علامہ راشد الخیری، خواجہ حسن نظامی

تاریخی:

ایم اسلم، عنایت اللہ التمش، نسیم حجازی، اسلم راہی،
قاضی عبدالستار، قمر اجنالوی

یہ ہیں اُردُو تاریخ کے اہم افسانہ نگار جنھوں نے عمدہ اور معیاری افسانے لکھ کر اُردُو ادب کے ذخیرہ میں اضافہ کیا۔

ہزارہ میں اُردُو افسانے کی روایت:

اُردُو ادب کا زور برصغیر پاک و ہند کے دوسرے علاقوں کے مقابلے میں سرحد میں تھوڑی دیر سے پڑا، اس کی وجہ تعلیمی کمی ہے لیکن تعلیم کی ترقی کے ساتھ ساتھ یہاں اُردُو زبان کی ترقی کی طرف توجہ شروع ہوئی۔ سب سے پہلے بزمِ سخن کی بنیاد رکھنے اور اسلامیہ کالج اور اس کے علاوہ دوسری علمی وادبی، تعلیمی سرگرمیوں کے نتیجہ میں یہاں کے اہل علم

وادب کی طرف متوجہ ہوئے اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ یہاں اُردُو کی ادبی نثر کا آغاز ۱۹۰۰ء سے بعد ہوتا ہے کیوں کہ ۱۹۰۳ء میں بزم کی بنیاد رکھی گئی۔ اُردُو کی ادبی نثر زوال کا شکار رہی اور یہی معاملہ اُردُو افسانے کے ساتھ بھی رہا۔ اس لیے افسانے کا آغاز بھی ذرا دیر بعد ہوا اور کوئی بڑا نام سامنے نہ آسکا لیکن بقول فارغ بخاری اس کے آغاز کا سہرا ''نصیرالدین نصیر'' کے سر ہے انھوں نے ۱۹۱۴ء میں لکھنا شروع کیا۔ اس ضمن میں بشیر احمد سوز رقمطراز ہیں:

> ''بیسویں صدی کے اوائل میں جہاں پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم کی افسانہ نویسی کا طوطی پورے ہندوستان میں بول رہا تھا اسی زمانے میں ہزارہ کے ایک دُور افتادہ اور پسماندہ گاؤں میں ایک ذہین افسانہ نگار نصیرالدین نصیؔر دنیائے علم وادب میں متعارف ہونے لگا۔ نصیرالدین نصیر نے ۱۹۱۴ء میں افسانہ نویسی کا آغاز کیا اور ۱۹۳۰ء تک مسلسل لکھتے رہے۔ اگرچہ ان کے افسانوں کا کوئی مجموعہ چھپ نہیں سکا لیکن ان کے افسانے نیرنگِ خیال، سرحد اور عالمگیر میں شائع ہوتے رہے۔ انھیں سرحد (خیبر پختونخوا) کا پہلا افسانہ نگار ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔''۵۴؎

ان کے افسانے اصلاحی اور مقصدی موضوعات پر مبنی تھے ان کے افسانوں میں ''سہاگن''، جوالامکھی''اور مولوی صاحب شہرت سے ہمکنار ہوئے صوبہ سرحد میں افسانے کے آغاز میں نصیرالدین نصیؔر کا نام ضرور اہم ہے لیکن کوئی بڑا نام نہیں۔ اس کے ساتھ ایک بڑا نام عنایت علی شاہ ہے جو پانچ برسوں تک مسلسل لکھتے رہے ان کے افسانوں میں ''اس کا خواب'' اور ''شاعر'' شامل ہیں اِن کا مشہور افسانہ جس میں سرحد کی عکاسی کی گئی ہے وہ ''خوبصورت لفافہ'' قابلِ ذکر افسانہ ہے۔ ۱۹۳۰ء تک یہ کچھ افسانہ نگار ملتے ہیں ان کے بعد آنے والے افسانہ نگاروں میں خان بہادر غلام حسن خان، شاطر غزنوی، مظہر گیلانی، اسیر انور ضیائی اور فارغ بخاری جیسے معتبر نام سامنے آئے جنھوں نے افسانے کے خدوخال پر چار چاند لگائے مظہر گیلانی کے افسانوں میں ''میری لاش''، ''سانپ کا انتقام''، ''ناگ رانی''، مشہور ہیں ان کے افسانوی مجموعے ''بدنصیب سادہ'' اور ''رنگین مشاہدے'' منظر عام پر آئے۔ فارغ بخاری سرحد کے پہلے صاحبِ مجموعہ افسانہ نگار ہیں اِن کے افسانوں میں اصلاحی اور مقصدی عناصر شامل ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعے ''ادب برائے زندگی''، ''مکافاتِ عمل''، ''عورت کا گناہ'' شامل ہیں لیکن ان کو زیادہ شہرت افسانوی مجموعہ ''عورت کا گناہ'' سے ہوئی، جس میں یہ عورت کے دردوغم کو بیان کرتے ہیں اور مرد کی عیاشیوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ناصر علی سید اپنے مضمون ''اُردُو افسانہ اور صوبہ سرحد'' میں لکھتے ہیں:

> ''نوجوان فارغ بخاری کے اس مجموعے میں عورت کی طرف داری بہت ہے اور مرد کی رنگین مزاجیوں اور عیاشیوں کے نتیجے میں عورت کی سسکیوں کو بہت گنجائش کے باوجود انھوں نے سسکاری نہیں بننے دیا حالانکہ اس زمانے میں اس کا رواج عام ہو چکا تھا فارغ بخاری کے افسانوں میں ان کی انسانی دوستی کا پرتو گہرا ہے لیکن بعض افسانوں میں کہانی یکطرفہ واردات کی کاروائی نظر آتی ہے اور مرد عورت کے منطقی رشتوں کو زیر بحث نہیں لایا جاسکا فارغ بخاری نے یہ مجموعہ اپنی بھری جوانی میں سرحد کے اُردُو ادب کو دیا۔''۵۵؎

ان کے بعد افسانہ نگاروں میں **مبارک حسین عاجز** کا نام ہے ان کے ہاں رومانی طرز فکر کے عناصر ملتے ہیں ان کے افسانوں میں ''اے مصور''، ''احساس ندامت''، ''رنگین کلی''، ''مجھے کسی کی تلاش ہے'' شامل ہیں۔ **رضا ہمدانی** نے اسلامی تاریخ و واقعات کو افسانوی رنگ میں پیش کیا ان کا افسانہ ''عہد'' کا تذکرہ کر سکتے ہیں۔ **ملک راج آنند** کا افسانہ ''کھویا ہوا بچہ'' جو کشمیر عوام کی کسمپرسی کی تصویر ہے۔ **شمیم بھیروی** کا ''لمباڈا'' جو ایک نفسیاتی افسانہ ہے۔ **محمد احسن** کا ''مادھو''، **سید حضرت شاہ** کا افسانہ ''چند آدمی آئے ہیں''۔ **خاطر غزنوی** کا ''چیخ''، **یونس سیٹھی** کا ''جلتے گال'' اور **ڈاکٹر عبدالرحیم** کا افسانہ ''خون کا داغ'' بہترین کاوشیں ہیں۔ اسی طرح فسادات کے حوالے سے **شفق ہزاروی** کے افسانوں میں ''سرخ پھول''، ''سفید چہرہ''، **عرش فرید** کا افسانہ ''مقدس گائے''، **محمد حسین** کا ''او جانے والے''، **قتیل شفائی** کا افسانہ ''فن اور فنکار'' اور ''کلا اور کلاکار''، **باسط سلیم** کا ''آنکھ مچولی'' شامل ہیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد کئی افسانہ نگاروں کی تخلیقات سامنے آئیں جن میں اہم نام رضا ہمدانی کا ہے ان کے افسانے ''غوبل'' اور ''کافر'' سرحد کے ماحول پر دو افسانے پیش کیے یہ کہانیاں محنت کش طبقہ کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرحیم کے افسانوں میں ''خون کا داغ'' اور ''رقص الموت'' شامل ہیں۔ عبدالقیوم شفق ہزاروی کے افسانوں میں ''بہار و خزاں''، ''ساتویں شادی''، ''داغ ناتمامی''، ''سفید چہرہ'' شامل ہیں۔ نعیمہ شہناز کے ہاں ''ہم دیوانے لوگ''، ''دیئے بجھا دو''، ''اے قافلے والو'' اور ان کا عمدہ افسانہ ''افسانہ لکھ رہی ہوں'' اسی سلسلے کے اہم افسانے ہیں۔ اسی کے ساتھ حقیقت نگاری کے رجحان میں فہمیدہ اختر نے سرحد کے دیہاتی ماحول کی عکاسی کی ہے ان کے افسانوں میں ''کشمالہ'' اور ''اپنے دیس میں'' شامل ہیں۔ بیگم سردار حسین کے افسانوں میں ''برف کا پھول''، ''دھند لکے'' اور ''کچے دھاگے'' اہم ہیں۔ سحر یوسفزئی کے ہاں ''آگ اور سائے''، ''کمبل''، ''اندھیرے کا بیٹا''، ''سبزہ اور چنار'' مشہور افسانے ہیں۔ فرید عرش کے افسانوں میں ''خدمتِ خلق''، ''گیدڑ سنگھی'' اور ''قربانی'' شامل ہیں جو اپنے معاشرتی

حقائق کی عکاسی کرتے ہیں۔

جدید نسل کے افسانہ نگاروں نے نہ صرف حقیقت نگاری کو آگے بڑھایا بل کہ اس میں نکھار اور تنوع بھی پیدا کیا اس دور کے افسانہ نگاروں میں منور رؤف کا نام اہم ہے ان کے افسانوی مجموعے ''انمول رتن''، ''طرفہ تماشہ'' اور ''یاجوج ماجوج'' شامل ہیں۔ طاہر آفریدی کا افسانوی مجموعہ ''دیدن'' ہے جو معاشرے کی کہانی ہے اِن کے افسانوں میں ''بیٹی کا بوجھ''، ''گھر''، ''پگڑی'' اہم ہیں انھوں نے پشتون معاشرے کی عکاسی کی ہے۔ سیّدہ حنا کے افسانوی مجموعوں میں ''جھوٹی کہانیاں'' اور ''پتھر کی نسل'' اہم ہیں یہ اپنے مشاہدے کی روشنی میں کہانی لکھتی ہیں اِن کے افسانوں میں ''تازہ کھیپ''، ''تھیٹر'' اور ''ایک لڑکی ایک لمحہ'' مشہور افسانے ہیں۔ اس دور میں اہم نام انور خواجہ کا ہے ان کے افسانوی مجموعے ''بوز نے بندر''، ''ناشناس''، ''بیکار'' اور تازہ افسانوی مجموعہ ''بریدہ بدن'' ہے انور خواجہ کے افسانے ان کے مطالعے اور گہرے مشاہدے کی وسعت یہ گواہی دیتے ہیں وہ جانوروں اور پرندوں کی نفسیات کے سفر میں انسانی جبلتوں اور فرد کے داخل تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ بقول بشیر احمد سوزؔ:

> ''جنسیات کے بیان اور انسانی نفسیات کی صورتیں دکھاتے وقت جذباتی ہیجان پیدا کرنے میں انور خواجہ کا قلم سبک رفتار نظر آتا ہے۔ ہمیں بعض اوقات وہ عصمت چغتائی اور سعادت حسن منٹو کے قریب قریب نظر آتے ہیں مگر تکنیکی لحاظ سے نہ تو ہم منٹو کا ثانی سمجھتے ہیں اور نہ عصمت چغتائی کا ترجمان وہ اپنے منفرد اسلوب سے اپنی منفرد فضائیں تخلیق کرتے ہیں۔'' ۵۶؎

اُمِ عمارہ لاہور میں کچھ عرصہ قیام کے بعد ۱۹۸۲ء میں ایبٹ آباد چلی آئیں اور آرمی برن ہال کالج میں بحیثیت لیکچرار پڑھاتی رہیں اِن کے ہاں زندگی کی حقیقتیں مختلف روپ میں بدلتی ہوئی ظاہر ہوتی ہیں۔ انھوں نے افسانوی ادب میں گراں قدر اضافہ کیا اُمِ عمارہ کا تعلق بنگلہ دیش سے تھا اس لیے ان کے افسانوں میں وہاں کے ماحول اور خاص قسم کے مسائل کی پرچھائیاں موجود ہیں لہٰذا ہجرت کا دُکھ اُن کے افسانوں میں نظر آتا ہے۔ بشیر احمد سوزؔ رقمطراز ہیں:

> ''وہ ادب برائے زندگی کی قائل ہیں۔ ان کی کہانیوں کا موضوع انسان اور انسانی زندگی کے نشیب و فراز ہیں وہ زندگی کی مثبت راہوں پر یقین رکھتی ہیں، جو سمجھا محسوس کیا لکھ دیا۔ دُکھ سکھ سب زندگی سے وابستہ ہیں۔ وہ اسی جیتی جاگتی کروٹیں بدلتی زندگی کی ترجمان

ہیں اُمِ عمارہ اپنے افسانوں میں ابلاغ کی قائل ہیں ۔بڑے بڑے مسائل کو بڑی خوبصورتی وتوازن سے یوں بیان کرتی ہیں کہ ماحول کے سارے خدو خال سامنے آجاتے ہیں۔''۵۷

ان کے افسانوی مجموعے'' آ گہی کے ویرانے''،'' درد روشن ہے''،''روشنی قید'' شامل ہیں اس کے علاوہ اِن کے وہ افسانے جو فسادات کے موضوع سے ہٹ کر لکھے گئے ان میں'' دردافزوں سہی''،'' کوئلہ بھئی نہ راکھ''،'' آ گہی کے ویرانے'' اہم ہیں۔اس کے ساتھ عطیہ سید کے افسانوی مجموعے'' حکایت جنوں'' اس افسانوی مجموعے میں انھوں نے مشرقی اقدار اور روّیوں کو بڑے سلیقے اور ٹھنڈے رنگوں میں پیش کیا ہے اِن کا دوسرا افسانوی مجموعہ'' شہرِ ہول'' ہے ان کے افسانوں میں'' فریب آرزو''،'' حکایت خونچکاں''،'' کرسمس کی شب''،'' مٹھی بند لمحہ''،''عشق تمام''، شامل ہیں۔نگہت مرزا کا افسانوی مجموعہ'' پیاسی چڑیا'' اور ان کے افسانوں میں'' توشہ''،''ہم دیکھیں گے''،'' ہے کہاں روشنی''،'' اُردُو زبان اور شلوار قمیض'' اور'' بے ثمر خواہشیں'' جیسے افسانے شامل ہیں۔سیّد مدثر شاہ کے افسانوی مجموعے'' زندان میں'' اور'' چھوٹا آدمی'' شامل ہیں۔سیّد مدثر شاہ کے افسانوں کے متعلق بشیر احمد سوزؔ لکھتے ہیں:

''سیّد مدثر شاہ نے زنداں میں شامل ہر تحریر کے حوالے سے معاشرے کے کئی اصلاح طلب مسائل کو موضوع بنایا ہے اگر وہ افسانوی ادب کی ضرورتوں اور فنی تقاضوں پر ذرا اور توجہ دیں تو ان کی صحیح راہنمائی کرتے ہوئے انھیں کم وقت میں ادبی حلقوں میں ایک معروف افسانہ نگار کی حیثیت سے متعارف کرائے گی۔''۵۸

پروین سیف کے افسانوں میں اصلاحی مقصد کے ساتھ معاشرے کے رویوں کی جھلک دکھائی دیتی ہے ان کے افسانوں میں'' پرایا دھن''،'' دولت''،'' جال''،'' برگ خزاں''،'' روگ''،'' نیا عزم'' وغیرہ شامل ہیں انھوں نے یہ افسانے تحریر کر کے معاشرے کے اندر ہونے والی برائیوں کی نقاب کشائی بڑی فنی مہارت سے کی ہے۔اس ضمن میں بشیر احمد سوزؔ یوں رقمطراز ہیں:

''پروین سیف عام طور پر ایسے موضوعات تلاش کرتی ہیں جن سے اصلاح کے پہلو زیادہ نمایاں ہوتے ہیں وہ اپنے گردوپیش کے سماجی اور معاشرتی رویوں اور مسائل سے اپنا مواد اکٹھا کرتی ہیں اور انھیں ہلکی پھلکی کہانیوں میں پیش کر دیتی ہیں۔''۵۹

مختصر افسانہ میں راجا ریاض الرحمٰن کو بڑی مہارت حاصل ہے۔وہ غیر ضروری باتوں سے اجتناب کرتے ہیں ان کے اسلوب میں کوئی اُلجھاؤ نہیں پایا جاتا ان کا افسانوی مجموعہ ''مرغِ بادنما سے ایک مکالمہ''اور افسانے ''روشنی اور سانپ''اور''بیہودہ''۔انھوں نے اپنے افسانوی مجموعہ میں جملوں اور مکالموں کو ایسے پیش کیا ہے کہ جو پہلی نظر میں قاری کو اپنی جانب متوجہ کر لیتا ہے۔بقول بشیر احمد سوزؔ:

> ''مرغِ بادنما' کی من پسند ہوا، مغرب کی ہوا ہے۔جو مغرب سے متاثر ہے اور مغرب ہی کی جانب اپنا رُخ کرنے میں عافیت سمجھتا ہے۔یہ اُن لوگوں پر طنز ہے جو مغربی طرزِ زندگی، اور مغربی اندازِ فکر کی چکا چوند سے متاثر ہیں اور مغربی فضا میں ہی اپنی بقا کو مضمر دیکھتے ہیں۔راجا ریاض الرحمٰن نے اس مکالمہ میں نہایت چابکدستی اور زیرکی کا ثبوت دیتے ہوئے افسانوی رنگ میں مقصدیت کو خاموشی اور غیر محسوس انداز میں پیش کیا ہے۔''۶۰؎

ہزارہ میں فیاض عزیز ایک اُبھرتا ہوا افسانہ نگار ہے اُنھوں نے ضلع مانسہرہ کی تحصیل بالاکوٹ میں رہتے ہوئے بلند پایہ افسانے لکھ کر ادبی حلقوں سے داد وتحسین سمیٹی۔فیاض عزیز موضوعات کی تلاش میں نہیں رہتے بل کہ وہ اپنے گہرے مشاہدے کی بنا پر کہانی تخلیق کرتے ہیں وہ معاشرے میں ہونے والے حالات و واقعات کو حقیقی صورت میں پیش کرتے ہیں ان کے افسانوی مجموعے میں''شہر کی آنکھ''،''جھیل کنارے''، ''لالہ زار کے داغ''،''آلاؤ'' شامل ہیں۔ان کی افسانہ نگاری پر بشیر احمد سوزؔ رقمطراز ہیں:

> ''فیاض عزیز بدلتے ہوئے حالات و واقعات پر کڑی نظر رکھتا ہے اپنے عہد سے آگہی اور نبض شناسی اس کے اندر بدرجۂ اتم موجود ہے۔وہ فضاؤں اور خلاؤں میں کھو جانے والا تخلیق کار نہیں بلکہ اپنے سماجی، تہذیبی اور معاشرتی رویوں اور اِقدار سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس کی کہانیاں حقائق پر مبنی ہوتی ہیں اور جو کہانیاں اپنے اندر حقائق کے رنگ رکھتی ہیں وہ میری، آپ کی اور ہم سب کی ترجمان بھی ہوتی ہیں اور دل پسند بھی۔''۶۱؎

انجم جاوید نے ہزارہ میں رہ کر عمدہ افسانے تخلیق کیے انھوں نے باہر کی دنیا سے ملنے والے دُکھ درد اور

مشکلات کو بخوبی برداشت کیا اور یہ تمام واقعات اس کے تجربے اور مشاہدے میں اضافہ کرتے چلے گئے اور قلم کے ذریعے انھوں نے اس کا اظہار کیا انجم جاوید افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی ہیں دیہاتی زندگی، لہلہاتے کھیت اس کی نفسیات کا حصہ ہیں وہ جدید صنعتی و تجارتی شہر میں انھیں گاؤں کا ماحول اور وہاں کے لوگ یاد آتے ہیں۔ان کے نمائندہ افسانوں میں ''خوشبو اور رومال''،''اور گڑیا روتی رہی''، ''ساتواں آسماں ''، ''بازگشت''،''شکریہ''،''لمحوں کی گرفت''،کھیل کھیل میں''،''آلارم'' شامل ہیں۔

اس کے علاوہ ہزارہ کے لکھنے والوں میں محمد بشیر رانجھا ان کے افسانوی مجموعے میں ''پلِ صراط''اوران کے افسانے''دُکھ کی دیمک''،''ریشمی خواب''،''شکست''،''شناخت کا المیہ''،''احساس''بہترین افسانے ہیں۔جانِ عالم کے افسانوں میں''وارث''،'' کاغذ کا شہر''،''برگد''،''مسرت اور روتی ہوئی نظم''،''دف''،''شانو''اور''درانتی''مشہور افسانے ہیں ۔ خالد قیوم تنولی کا''ٹافی''اور ان کے افسانوں کی کتاب ''تریاق'' کے نام سے ۲۰۱۱ء میں شائع ہوئی۔نیازت علی نیاز اچھے افسانہ نگار ہیں ان کے افسانے''ادھوری کہانی''،''دہلیز کے پار'' جیسے عمدہ اور معیاری افسانے لکھے ۔سیّد ماجد شاہ کے افسانوں میں ''مذاق''، ''حنا''، ''انتہائی گھٹیا''، ''انصاف''،''مکروہ''، ''حرامزادے''،''کسر اعتماد''،''خود غرض ''، ''روح ''، ''زمین کی چھاپ''، ''نماز''جیسے افسانے تحریر کیے۔ پروفیسر دل نواز عارفؔ کے افسانوں میں''موتی''اور''بے روزگار'' قابلِ قدر افسانے ہیں۔وہ حقیقی زندگی کے تلخ حقائق کا اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں۔وہ کسی کردار کی آپ بیتی ہوتے ہیں اُن کے افسانے قال کے بجائے حال ہوتے ہیں۔عادل سعید قریشی ہزارہ کی سرزمین کے اُبھرتے ہوئے افسانہ نگار ہیں انھوں نے بہت سے افسانے تخلیق کیےان کے افسانوں میں''رانڑوں''،''لمبو''،''معصومہ''،''وزٹنگ''،''نور''،''عادت''،میرانامہ میری زوجہ کے نام''،''راہ سکون''ان کی شاندار تخلیقات ہیں۔ساجد خان کے دوافسانوی مجموعے''مجھے روشنی چاہیے''اور''دائرے کا اسیر'' شامل ہیں۔مفیدہ ماجد کے افسانوں میں''فاختہ''اور''بچھرا''نمایاں ہیں۔وقاص عزیز کے''مٹی کی مورت''اور ''بیلا''،خواجہ تنویر علوی کے''محبت کا آلاؤ''اور''عورت پر ظلم کب تک'' شامل ہیں۔مغرب آفندی نے''لفیٹی سے پہلے''اور''قصہ کوتاہ''جیسے افسانے لکھے یہ وہ افسانہ نگار ہیں جنھوں نے سرزمین ہزارہ میں رہ کر صنف افسانہ کو اعلیٰ مقام بخشاان کے گہرے مشاہدے اور فنی مہارت سے صنف افسانہ کو ہزارہ میں پروان چڑھنے کا موقع ملا۔

ہزارہ کی ادبی تاریخ اگرچہ افسانہ نویسی کے اعتبار سے خالی نہیں تھی ہزارہ میں صنفِ افسانہ کو متعارف کروانے والے نصیر الدین نصیر،صادق ملک،قتیل شفائی،الطاف پرواز،آنسہ نسیم،اختر مفتی،آمنہ نرگس نے افسانوی ادب پر اپنے گہرے اثرات چھوڑے جو بعد میں آنے والے افسانہ نگاروں نے استفادہ کیا دور جدید میں ہزارہ میں ادب تخلیق

ہو رہا ہے اور لکھنے والے عمدہ اور معیاری ادب تخلیق کر رہے ہیں۔ ہزارہ میں ادب کے تخلیق پر ساجد خان سے ایک انٹرویو میں پوچھا گیا تو انھوں کا کہنا تھا:

> ''ہزارہ کی ادبی تاریخ بڑی روشن اور شاندار رہی ہے ہزارہ میں جو ادب تخلیق ہو رہا ہے وہ پاکستان بلکہ اُردُو دنیا کے معاصر ادب کے برابر کی سطح کا ہے۔غزل، نظم، افسانہ، ڈراما، انشائیہ، تحقیق، تنقید غرض یہ کہ ہر قسم کا ادب یہاں بڑے تواتر اور انہماک سے تخلیق ہو رہا ہے۔سرزمین ہزارہ کو قدرت نے حسنِ لازوال سے نوازا ہے اور انہی حسین وادیوں میں زندگی بسر کرنے والے تخلیق کار جو بھی ادب تخلیق کر رہے ہیں وہ انتہائی اعلیٰ معیار کا ہے۔ بزرگوں میں سلطان سکون، آصف ثاقب، قاضی سعید ناز، یحییٰ خالد، صوفی عبدالرشید، پروفیسر بشیر احمد سوزؔ جیسے نامی گرامی بزرگ شاعر اور ادیب موجود ہیں جن کی زندگیاں اسی مشغلے میں گزر رہی ہیں۔اس کے بعد کی نسل میں محمد بشیر رانجھا، احمد حسین مجاہد، محمد حنیف، جانِ عالم، امتیاز الحق امتیاز، میجر امان اللہ امان، قاضی ناصر بختیار خان، اجمل نذیر، عامر سہیل، عبدالوحید بسمل، پروفیسر فرید، سید انوار الحق سید اور نوجوانوں میں کاشف بٹ، تاج الدین تاج، خورشید احمد عون، پرویز ساحر، ساجد حمید ساجد، سہیل احمد صمیم، فرحان انجم، جعفر محمود ہاشمی اور دیگر بہت سے شاعر اور ادیب جن کے نام فوری طور پر ذہن میں نہیں آ رہے، نہ صرف مسلسل لکھ رہے ہیں بلکہ انھیں ملک گیر شہرت بھی ملی ہے۔ جہاں تک معیار کی بات ہے تو معیار کے کئی پیمانے ہیں۔ میرے خیال میں اس وقت معیاری ادب کہیں بھی تخلیق نہیں ہو رہا۔البتہ اچھا ادب لکھا جا رہا ہے جو خوش آئند بات ہے۔''۶۲؎

الغرض ہزارہ میں بلند پایہ ادب تخلیق ہو رہا ہے اور ہر صنف میں لکھا جا رہا ہے اور بہت سے لکھاری سامنے آ رہے ہیں جو افسانہ لکھ کر ادب کے ذخیرہ میں اضافہ کر رہے ہیں اور ہزارہ کے بعض افسانہ نگاروں نے اپنے گہرے مشاہدے اور ماحول کے حالات و واقعات کے پیش نظر افسانے تخلیق کر کے ملک بھر کے اہلِ قلم سے داد و تحسین سمیٹی ہے اور ان سب کا سہرا ہمارے لکھاریوں کے سر ہے کہ جنھوں نے ہزارہ کو صنف افسانہ سے نوازا۔جس تواتر کے ساتھ ہزارہ میں افسانوی ادب تخلیق کیا جا رہا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آنے والے وقتوں میں اس زرخیز اور مردم خیز سرزمین سے بڑے پائے کے افسانہ نگار جلوہ گر ہوں گے نیز یہ کہ اس دھرتی پر افسانے کا مستقبل شاندار ہوگا۔

حوالہ جات:

۱۔ رفیع الدین ہاشمی، اصنافِ ادب، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۱۲۹

۲۔ Edger Allan Poe's thesis that stories must have a coumpact,nified,United effect, page 415

۳۔ وقار عظیم، سیّد، فنِ افسانہ نگاری، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۱۶

۴۔ ایضاً، ص ۲۹

۵۔ ایضاً، ص ۲۹

۶۔ ایضاً، ص ۲۹

۷۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، اُردو کی ادبی تاریخ کا خاکہ، اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۶۹ء، ص ۱۷۲

۸۔ وقار عظیم، سیّد، فنِ افسانہ نگاری، ص ۱۶

۹۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۵۲۲

۱۰۔ فرزانہ شاہین، اُردو کے نمائندہ افسانہ نگار، ڈائمنڈ آرٹ پریس، ۲۰۰۹ء، ص ۱۰

۱۱۔ انور جمال، ادبی اصطلاحات، نیشنل بُک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، س۔ن، ص ۱۰

۱۲۔ وقار عظیم، سیّد، داستان سے افسانے تک، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۲۲

۱۳۔ عابد علی عابد، سیّد، اصولِ انتقادِ ادبیات، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۵۲۷

۱۴۔ انوار احمد، اُردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، س۔ن، ص ۱۸

۱۵۔ عبادت بریلوی، تنقیدی زاویے۔ اُردو افسانے پر ایک نظر، اُردو اکادمی سندھ، کراچی، ۱۹۶۹ء، ص ۲۵

۱۶۔ عبدالقادر سروری، دُنیائے افسانہ، مکتبہ ابراہیمیہ، حیدرآباد، س۔ن، ص ۲۵

۱۷۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اُردو افسانہ اور افسانہ نگار، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۱۴

۱۸۔ رفیع الدین ہاشمی، اصنافِ ادب، ص ۱۳۳

۱۹۔ وقار عظیم، سیّد، داستان سے افسانے تک، ص ۴۱۴

۲۰۔ پروین اظہر، ڈاکٹر، اُردو میں مختصر افسانہ نگاری کی تنقید، ایجوکیشنل بُک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۰ء، ص ۳۰

۲۱۔ ایضاً، ص ۳۲

۲۲۔ وقار عظیم، سیّد، داستان سے افسانے تک، ص ۲۱

۲۳۔ ایضاً،ص۲۱۴

۲۴۔ ایضاً،ص۲۱۴

۲۵۔ ایضاً،ص۲۳

۲۶۔ رفیع الدین ہاشمی،اصنافِ ادب،ص۱۳۴

۲۷۔ خالدعلوی،ڈاکٹر،انگارے کا تاریخی پس منظراور ترقی پسند تحریک،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی،۱۹۹۵ء،ص۱۴

۲۸۔ قمر رئیس،ڈاکٹر،اُردو افسانے میں انگارے کی روایت،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی،۱۹۷۸ء،ص۸۱

۲۹۔ انور سدید،ڈاکٹر،اُردو ادب کی تحریکیں،انجمن ترقی اُردو، پاکستان،۲۰۱۳ء،ص۴۳۵

۳۰۔ قمر رئیس،ڈاکٹر،ترقی پسند ادب کے پچاس سال،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی،س۔ن،ص۳۳۷

۳۱۔ وقارعظیم،سیّد،داستان سے افسانے تک،ص۲۵

۳۲۔ انور سدید،ڈاکٹر،اُردو ادب کی تحریکیں،ص۴۴۲

۳۳۔ وقارعظیم،سیّد،داستان سے افسانے تک،ص۲۴۰

۳۴۔ وقارعظیم،سیّد،نیا افسانہ،مطبوعہ جناح پریس، دہلی،ص۹۹

۳۵۔ ایضاً،ص۱۰۲

۳۶۔ اسلم جمشید پوری،ڈاکٹر،ترقی پسند اُردو افسانہ اور چند اہم افسانہ نگار،موڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی،۲۰۰۲ء،ص۳۹

۳۷۔ خلیل الرحمٰن اعظمی،اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک،ایجوکیشنل بُک ہاؤس،علی گڑھ،ص۱۹۱

۳۸۔ اسلم جمشید پوری،ڈاکٹر،ترقی پسند اُردو افسانہ اور چند اہم افسانہ نگار،ص۴۶

۳۹۔ وقارعظیم،سیّد،داستان سے افسانے تک،ص۲۴۰

۴۰۔ وقارعظیم،سیّد،نیا افسانہ،ص۱۱۴،۱۱۵

۴۱۔ گوپی چند نارنگ،اُردو افسانہ کی روایت اور مسائل،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۱۹۸۶ء،ص۱۳۳

۴۲۔ اسلم جمشید پوری،ڈاکٹر،ترقی پسند اُردو افسانہ اور چند اہم افسانہ نگار،ص۱۰۴

۴۳۔ راج نرائن راز،خواجہ احمد عباس افکار،گفتار،کردار،ہریانہ اُردو اکادمی،۱۹۸۹ء،ص۴۴

۴۴۔ وقارعظیم،سیّد،نیا افسانہ،ص۱۲۴

۴۵۔ گوپی چند نارنگ،اُردو افسانہ کی روایت اور مسائل،ص۴۲۶

۴۶۔ انور سدید،ڈاکٹر،اُردو ادب کی تحریکیں،ص۴۶۸

۴۷۔سلیم اختر،ڈاکٹر،افسانہ اورافسانہ نگار،(تنقیدی مطالعہ)،لاہور،۱۹۹۱ء،ص۳۳

۴۸۔محمد عالم خان،اُردُو افسانے میں رومانی رجحانات،فراز کمپوزنگ سنٹر،لاہور،س۔ن،ص۵۴۸

۴۹۔ایضاً،ص۵۴۸

۵۰۔فرمان فتح پوری،ڈاکٹر،اُردُو افسانہ اورافسانہ نگار،الوقار پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۳ء،ص۲۷

۵۱۔ایضاً،ص۲۷

۵۲۔ایضاً،ص۶۵

۵۳۔محمد عالم خان،اُردُو افسانے میں رومانی رجحانات،ص۵۶۵

۵۴۔بشیر احمد سوز،پروفیسر،ہزارہ میں اُردُو افسانے کی روایت،ادبیات ہزارہ،مرکز تحقیق واشاعت،۲۰۱۲ء،ص۲۵

۵۵۔مجلّہ،خیابان،جامعہ پشاور،بہار۲۰۰۶ء،ص۱۹۶،۱۹۷

۵۶۔بشیر احمد سوز،پروفیسر،ہزارہ میں اُردُو زبان وادب کی تاریخ،ادبیات ہزارہ،مرکز تحقیق واشاعت،۲۰۱۰ء،ص۱۲۹

۵۷۔ایضاً،ص۱۴۳

۵۸۔بشیر احمد سوز،پروفیسر،ہزارہ میں اُردُو افسانے کی روایت،ص۲۵۱

۵۹۔بشیر احمد سوز،پروفیسر،ہزارہ میں اُردُو زبان وادب کی تاریخ،ص۱۵۶

۶۰۔ایضاً،ص۱۶۱

۶۱۔بشیر احمد سوز،پروفیسر،ہزارہ میں اُردُو افسانے کی روایت،ص۲۹۳

۶۲۔روزنامہ،K2ٹائمز،ایبٹ آباد،۳۰اکتوبر۲۰۱۳ء

بابِ سوم:

افسانوی مجموعہ ''دائرے کا اسیر''
فکری مطالعہ

فکری مطالعہ:

شعر و ادب میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنے کام کی وجہ سے اور فکری ترفع کی وجہ سے آج بھی زندہ ہیں یہ لوگ اس دنیا سے کوچ کر جانے کے بعد بھی اپنے کام کی وجہ سے زندہ ہوتے ہیں اور یہ ان کا حق ہے۔ان کی تحریریں ان کی شخصیت کے مختلف نوع پہلوؤں کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ یہ اپنے گہرے مشاہدے سے اپنی معلومات و مشاہدات اور احساسات کو تحریر کر دیتے ہیں۔جن کو پڑھ کر اس دور کے تمام حالات و واقعات کا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے اور وہی تصویر بنتی ہے جو مصنف کے ذہن میں ہوتی ہے ہر باشعور مصنف کی تحریر کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے اور یہی مقصدیت زندگی کی روح اور ادب کی جان ہے۔اسی سے کسی تخلیق کار کی تجربہ کاری، کاری گری، بلند خیالی، بلند نگاہی اور دوسروں کی بات سمجھنے کا اندازہ ہوتا ہے۔کوئی بھی ادیب ہو یا شاعر وہ عوامی شعور سے اپنا ذاتی شعور وابستہ رکھتا ہے اس کی تخلیقات میں معاشرتی حالات و واقعات، سماجی اچھائی، برائی اور تہذیب کے علاوہ معاشرے کی ثقافت کی جھلکیاں نمایاں طور پر دیکھی جاسکتی ہیں۔ایک اچھا ادیب یا شاعر اپنے کسی کام کو انجام دینے اور حقائق کو جاننے کی ذہنی صلاحیت کو اخلاق کے دائرے میں رہتے ہوئے اس کو تخلیق کرتا ہے اور یہ کسی زمانے یا علاقے تک محدود نہیں ہوتا بل کہ اس کے تخلیقی کام میں پوری دنیا کے مسائل موجود ہوتے ہیں وہ مسائل جو آج کل درپیش ہیں اور یہ پوری دنیا پر اپنے اثرات مرتب کر رہے ہیں۔

ایک تخلیق کار اپنے قلم کے ذریعے معاشرے میں ہونے والی ناہمواریوں کو تحریر کرتا ہے وہ اپنے جذبات اور نظریات پیش کرتا ہے لیکن اس کی تحریریں اس دور کے تمام انسانوں کی زندگی اور مسائل کی ترجمانی کرتی ہے۔افسانے ہوں یا ناول، مضامین ہوں یا سفرنامے یہ سب معاشرے میں ہونے والے تغیرات کو ظاہر کرنے کے ذریعے ہیں۔جن میں یہ سب مسائل موجود ہوتے ہیں جو معاشرے میں چل رہے ہوتے ہیں ان پر غور و فکر کرنا ہماری ذمے داری ہے تا کہ ان سے چھٹکارہ پایا جاسکے۔

افسانے کی بنیاد زندگی کا کوئی نہ کوئی واقعہ ہوتا ہے تخلیق کار اس کو احسن طریقے سے پیش کرتا ہے۔افسانہ نگار اپنی تخلیقی ہنرمندی اور ماحول کے حالات و واقعات کو بڑی ہنرمندی سے افسانے میں ڈھال لیتے ہیں، یہ ہنر ساجد خان کو آتا ہے اِن کے افسانے مختلف اخبار اور رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ادبی انجمنوں کے ساتھ بھی ان کا گہرا تعلق ہے اور ایک کارکن کی حیثیت سے بھی ادب کی خدمت میں لگے رہتے ہیں انھوں نے موجودہ حالات و واقعات کے تناظر میں صرف اپنے کالموں کے ذریعے نئی فکر دینے کی کوشش کی بل کہ ادب کی صنف افسانہ نگاری میں طبع آزمائی کی۔اور ملک بھر کے اہل قلم سے داد و تحسین سمیٹی ہے۔اس ضمن میں محمد اسفر آفاقی یوں رقمطراز ہیں:

''ساجد خان بھی اسی صف کا ایک جینوئن تخلیق کار ہے۔ جو ایک مختصر عرصے میں بطورِ افسانہ نویس اور کہانی کار اپنی شناخت اور مقام بنا چکا ہے۔ ساجد خان کے مشاہدے کی حس عام لوگوں کی بہ نسبت بہت تیز اور عمیق ہے جو اپنے ارد گرد جو کچھ دیکھتا ہے اور جس زاویے سے دیکھتا ہے وہ اسے اپنے قارئین کے سامنے اسی انداز اور زاویے سے پیش کرتا ہے۔''[1]

کسی بھی فن پارے کو تخلیق کرنے کے لیے مصنف کے ذہن میں ایک بڑی فکر ہوتی ہے وہ معاشرے میں ہونے والے حوادثات کو پیش کرتا ہے، بل کہ ان کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ یہ ایسے مسائل ہیں جو انسانی زندگی کو دیمک کی طرح کھائے جا رہے ہیں۔ ساجد خان نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ ان حقائق کو ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے وہ اپنے ارد گرد ہونے والے واقعات کو اپنے گہرے مشاہدے سے اپنے اوپر طاری کر لیتا ہے اور قلم کے ذریعے اس کا اظہار کرتا ہے وہ معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں سے بھی واقف ہے اور انہی المیوں اور سانحات کو کمالِ مہارت سے اس کا اظہار کرتا ہے۔ احمد جاوید لکھتے ہیں:

''ساجد خان کی کہانیوں کے واقعات اُن چنگاریوں کی طرح ہیں جو ایک بڑے آلاؤ سے اٹھتی ہیں۔ سب کو نظر آتی ہیں مگر پھر راکھ بن کر سروں پر آ گرتی ہیں۔ ہم، جس سماج میں رہتے ہیں اُن میں المیے اور سانحات کئی اسباب سے پھوٹتے ہیں اور ہم اپنی بے خبری، معصومیت، بے بسی اور لاچارگی کے باعث اُن کا شکار بن جانے کے سوا اور کچھ کر بھی نہیں سکتے۔ کبھی کوئی المیہ حیطۂ غیب سے متشکل ہوتا ہے اور مقسوم کہلاتا ہے اور کبھی سماجی معاشرتی ناانصافیوں کا شاخسانہ بن کر سامنے آتا ہے اور دنیا تاریک کر جاتا ہے۔''[2]

یہ دراصل تخلیق کار کی نفسیات ہوتی ہے کہ جیسا وہ دیکھتا ہے، محسوس کرتا ہے اور اس کا ویسا ہی اظہار کر دیتا ہے اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج بھی پیش کرتا ہے کسی بھی تخلیق کار کی تخلیق کے پیچھے کوئی نہ کوئی مقصد اور سوچ کار فرما ہوتی ہے جو قاری کے ذہن پر کچھ نہ کچھ اثر ضرور چھوڑتی ہے۔ فکر کے متعلق ابوالاعجاز حفیظ صدیقی یوں رقمطراز ہیں:

''نفسیات کی اصطلاح میں یہ وہ ذہنی عمل ہے، جس سے کام لے کر ہم مقدمات کو

ترتیب دیتے ہیں اور نتائج کا استنباط کرتے ہیں۔''[۳]

اسی ذہنی عمل کے ساتھ وہ اپنی تحریروں میں ایک ایسا طلسم پیدا کرتے ہیں کہ اس کی فکر اور قاری کی فکر ایک ہو جاتی ہے۔ایک اچھا تخلیق کار کسی فن پارے کو ایسے تحریر کرتا ہے کہ اس کے ذریعے دوسرے انسانوں کے احساسات و جذبات کی ترجمانی ہو سکے۔جسے پڑھ کر انسان یہ کہنے پر مجبور ہو جائے کہ گویا یہ سب بھی میرے دل میں تھا اور یہی کہانی سچی ہوتی ہے جو قاری کو اپنا ہم نوا بنا لے۔ساجد خان بھی انہی مسائل کو اُجاگر کرتے ہیں وہ اپنی کہانیوں کو اپنے ذاتی تجربات کی بنا پر پیش کرتے ہیں اور اپنے اردگرد ہونے والے واقعات سے کہانی کو تخلیق کرتے ہیں۔اپنے آس پاس ہونے والے سانحات سے واقف ہیں اور وہی بیان کرتے ہیں، جو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوتا ہے۔اس سلسلے میں بشیر احمد سوزؔ یوں رقمطراز ہیں:

''ساجد خان زمینی حقائق اور انسانی مسائل کا نمائندہ قلم کار ہے۔وہ زندہ دلوں کی باتیں زندہ لوگوں سے کرتا ہے جن میں درد و کرب بھی ہے اور رجائیت کے عناصر بھی موجود ہیں۔اس کی کہانیوں میں زندگی کے تجربات بولتے نظر آتے ہیں۔اس کی کہانیاں پڑھ کر یوں لگتا ہے کہ وہ اطراف کے جھونپڑوں اور گھروندوں کے کواڑوں میں جھانک جھانک کر انسانوں کے تلخ و شیریں واقعات کو اپنی آنکھوں سے بھر لیتا ہے اور پھر انہیں نہایت چابکدستی اور پرکاری کے ساتھ نوکِ قلم سے اوراق پر بکھیر دیتا ہے گویا مشاہدے کی گہرائی اور گیرائی اس کی کہانیوں کا اصل سرمایہ ہے۔''[۴]

فن کار فانی ہوتا ہے، اور طبعی عمر کے بعد مر جاتا ہے لیکن اُس کا فن نسبتاً پائیدار ہوتا ہے اور فن کار اُسی فن کے وسیلے سے پہچانا جاتا ہے اور زندہ رہتا ہے۔بڑا شاہکار اپنے خالق کو بھی بڑا بنا دیتا ہے انسان کا کہانی سے رشتہ بڑا گہرا ہے کیوں کہ ہر ایک انسان کئی کہانیوں سے جڑا ہوتا ہے یہ تخلیق کار کا انداز اور اس کی ہنرمندی ہوتی ہے کہ وہ قاری کو اپنے ساتھ جوڑے رکھتا ہے۔ایک زندہ فن کار ہی زندہ ادب تخلیق کرتا ہے ایسا ہی انھوں نے بھی کیا وہ معاشرے میں ہونے والے واقعات و حوادثات کو سامنے لاتے ہیں اور حقیقت کو بیان کرتے ہیں کیوں کہ ہم جس دنیا میں رہ رہے ہیں۔ہم جس معاشرے میں رہ رہے ہیں اگر ہم نظر دوڑائیں تو یہ سب نظر آئے گا ہر طرف لوٹ مار، دھوکہ دہی، فراڈ جیسے واقعات دیکھنے اور سننے میں ملتے ہیں۔ہمارے شاعر نے کیا خوب لکھا ہے:

''امیرِ شہر غریبوں کو لوٹ لیتا ہے
کبھی بہ حیلۂ مذہب کبھی بنام وطن''۵؎

وہ اُن پرقلم اُٹھاتا ہےاُن کی تحریروں میں اُس دور کی بھرپورعکاسی ملتی ہے۔اسی طرح کسی بھی فلسفی کے فلسفے کو سمجھنے کے لیےاُس کے دوراور دیار کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔آفاقی ادب میں اپنا دور جلوہ گر ہوتا ہےمگر وہ ہوتا ہر دوراور دیار کے لیے ہے یہی سب کچھ ساجد خان نے اپنی کہانیوں میں بیان کیا ہے۔اس ضمن میں فرحان انجم یوں رقمطراز ہیں:

''میں ساجد خان کوایک زندہ فن کار کہوں گا کیوں کہ ان کی تحریر میں زندگی متحرک نظرآتی ہے۔انہیں اپنی کہانی کی تلاش میں کہیں دورنہیں جانا پڑتا وہ اپنے گردوپیش بکھرے ہوئے موضوعات کواپنے اندرسموکراپنے گردوپیش سے ہی کہانی تخلیق کرتا ہے۔چونکہ ساجد خان کاتعلق عوام سے ہےاوران کی تحریروں کاتعلق بھی عوام سے ہی ہے۔یوں ان کے قول وفعل،تحریروں اورطرزِ زندگی میں کوئی تضاد نظرنہیں آتا۔ان کاقلم ہمارے معاشرے کی سفاکیوں کا بغیرکسی تکلف کے پردہ چاک کرتا نظرآتا ہے۔درحقیقت صداقت ہی خیر کا نام ہےاور بددیانتی سراسرشر ہے۔اس کی کہانی میری کہانی ہےاور آپ سب کی بھی،ان کا کمال یہ ہے کہ وہ زندگی کی حقیقتوں کو ہمارے اردگردپھیلی تلخ سچائیوں کوبغیرکسی لگی لپٹی کےاوراق کی زینت بناتے ہیں۔''۶؎

کوئی بھی بڑاادیب اپنے معاشرےاوراپنے دور کے مسائل ومصائب سےچشم پوشی نہیں کرتا کوئی بھی ادیب یا شاعراس وقت اچھا ادب تخلیق کرے گا جب وہ اپنے اردگرد رونما ہونے والے واقعات کوبخوبی سمجھتا ہوگا اس کا ادراک رکھتا ہوگا کیوں کہ ایک انسان جب بہت سے دُکھ تکلیف برداشت کرتا ہےاورظلم وستم کے وہ واقعات جو معاشرے میں آئے روز ہوتے رہتے ہیں ان کواپنی آنکھوں سے دیکھنا،سہنا، برداشت کرنا اور جب اس کوقلم کے ذریعےاس کااظہارکر کےعوام کے سامنے لانا جن سے وہ بےخبر رہتی ہےوہ ان کے دل ودماغ کومتاثر کرتا ہے۔ساجد خان بھی اپنے معاشرے،ماحول اوردیگر ہونے والےواقعات کودیکھتا ہے،محسوس کرتا ہےاپنے معاشرے میں ہونے والی برائیوں کی نشاندہی کرتا ہےاورسب سچ لکھتا چلا جاتا ہے۔وہ دوسروں کے دُکھ درداوراُن کی نفسیاتی کیفیات کو اپنے اوپرطاری کر لیتے ہیں اوروہی لکھتے ہیں جوسچ پرمبنی ہوتا ہے۔اس ضمن میں شمیم حیدرسید کچھ یوں رقمطراز ہیں:

’جب انسان جبر اور برداشت کی قوتوں سے تجاوز کر جائے اور معاشرے میں بے یقینی
کی کیفیت ہو تو اچھا ادب تخلیق ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ ظلم اور جبر کی چکی میں پس کر اور سچ
کی چھلنی سے نکھر کر اور کرب کے آنسوؤں سے ڈھل کر لکھا جاتا ہے۔ اور جب وہ
منظر عام پر آتا ہے تو عوام الناس کے دلوں پر اتر کر اثر کرتا ہے۔‘‘ ۷

ساجد خان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ’’دائرے کا اسیر‘‘ نہایت عمدہ افسانوی مجموعہ ہے جو اپنے اندر پندرہ افسانے سموئے ہوئے ہے۔ ان کے ہر افسانے میں کوئی نہ کوئی نیا واقعہ بیان کیا گیا ہے ان کے موضوعات میں بوقلمونی ہیں، جو قاری کو اپنے ساتھ جوڑے رکھتا ہے ان کے افسانوں میں معاشرتی، معاشی، نفسیاتی، جذباتی، سیاسی غرض ہر قسم کے پہلو نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعے پر اجمل نذیر یوُں تبصرہ کرتے ہیں:

’’دائرے کا اسیر ایک ایسا افسانوی مجموعہ ہے کہ جس کا ہر افسانہ قدم جکڑ لیتا ہے، الفاظ
کی بُنت کانوں میں رس گھولتی ہے اور افسانوی ماحول کو دل کو متلاطم کیے رکھتا ہے۔‘‘ ۸

آگے چل کے اجمل نذیر ان کے افسانوں میں ورائٹی اور تنوع کے بارے میں لکھتے ہیں:

’’موضوعات کا تنوع دائرے کا اسیر کو ایک بہترین افسانوی مجموعہ اور ساجد خان کو
باشعور، قادرالکلام اور مستند لکھاری کے طور پر پیش کرتا ہے۔ ان کی تحریروں میں
جامعیت بھی ہے اور ٹھہراؤ بھی، کہیں بھی احساس نہیں ہوتا کہ لکھاری نے عجلت کا
مظاہرہ کیا ہو اور کڑی سے کڑی جوڑ کر تکمیلی مراحل طے کرنے کی کوشش کی ہو۔‘‘ ۹

افسانوی مجموعے ’’دائرے کا اسیر‘‘ کا پہلا افسانہ ’’بے بسی، بے چارگی، درماندگی‘‘ ہے اس افسانے میں فلسفیانہ انداز سے گفتگو کی گئی ہے اور اپنے اصلیت کو پہچان لینے پر بات کی گئی ہے اس افسانے میں مصنف نے ایک ایسے شخص کو پیش کیا ہے، جو وسیع المطالعہ ہے وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ سب فانی لیکن پاس بیٹھے دوسرے شخص کہتے ہیں کہ ابدی ہے انسان کا جسم فانی ہے جب کہ اس کی روح غیر فانی ہے اس کے علاوہ اس افسانے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ انسان اپنے آپ کو بہت تیز سمجھتا ہے وہ بہت سے ایسے مسائل سے دوچار ہے جس سے وہ ناواقف ہے۔ مثلاً وہ جو کھانا کھا رہا ہے، جو لقمہ چبا رہا ہے وہ کہاں سے آیا ہے، کون خریدتا ہے، جب وہ لقمہ اس کے منہ و حلق سے نیچے جائے گا اس

کے معدے میں وہ وہاں جا کر اُسے فائدہ کرے گا یا نقصان اس کا تعاقب بھی انسان نہیں کرسکتا ہے۔افسانہ میں دنیا اور اسکے فانی اور ابدی ہونے پہ بحث کی گئی ہے ایک شخص ان کی بحث میں شامل ہوتا ہے اس افسانہ پہ مدیر اعلی شعروسخن مانسہرہ جان عالم نے ایک مفصل مضمون بھی اپنے رسالے میں شامل کیا اور اس افسانہ کو شمارے میں پہلے نمبر پہ رکھا مصنف کہتا ہے کہ:

''انسان تعاقب نہیں کرسکتا وہ تو اُس نوالے کا تعاقب کرنے سے قاصر ہے جو وہ اپنے ہاتھ سے اپنے حلق سے نیچے اتارتا ہے۔وہ کہاں سے آیا، کن ہاتھوں نے مس کیا، کب بکھرا، کیسے بکھیرا، کہاں بکھرا، کن ہاتھوں سے بکھرا؟ کس مٹی نے کس کوکھ میں لیا، کس بوند نے زندگی سے ہمکنار کیا، کس اوزار سے کٹا، کس نے پیسا، کس نے اُٹھایا، کدھر لے گیا، کہاں لے کر گیا، کس نے باندھا، کیسے باندھا، کہاں باندھا؟ کس نے خریدا، کونسا خریدا، کہاں سے خریدا؟ کس نے پہنچایا، کہاں پہنچایا، کیسے پہنچایا؟ کس نے گوندھا ،کس نے پکایا، کون کھائے گا اور کب کھائے گا؟'' ۱۰

گو کہ دنیا میں جتنا نظام بھی چل رہا ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ کی مرضی سے چل رہا ہے۔ہم ماضی سے صرف سبق حاصل کر سکتے ہیں جو لوگ ماضی کو اپنے ساتھ لے کر چلتے ہیں ہر وقت ماضی پر کُڑھتے رہتے ہیں یا یہ سوچتے ہیں کہ مستقبل میں کیا ہوگا وہ کسی بڑے مسئلے سے دوچار ہو جاتے ہیں۔اس افسانے میں ایک شخص نے کہا:

''سمندر میں سکوت اور وقار ہے۔ندی میں شور اور چھچھورا پن۔'' ۱۱

مگر اس کے تعاقب میں بیٹھے ہوئے دوسرے شخص نے اسے ٹوکا اور کچھ اس طرح کہا:

''مگر سمندر بھی تو انہی ندیوں کے ہونے سے سمندر ہے ندیاں نکال دو، سمندر کہاں؟ قطرے کی کیا اوقات کہ اس میں دجلہ دکھائی دے۔'' ۱۲

دنیا میں جتنا نظام بھی ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کا ہے وہ چاہیں تو قطرے میں سمندر بنا دیں اور چاہیں تو سمندر کو ایک قطرہ۔ یہ دنیا دراصل فانی ہے،ہم اصل کی پہچان ہی نہیں کر پاتے اور جب جسم سے روح نکل جاتی ہے،جس کو دیکھ کر

ہم روتے ہیں، آہ وزاریاں کرتے ہیں، ماتم کرتے ہیں، جس سے لپٹ لپٹ کر بین وغیرہ کرتے ہیں دراصل وہ سب جھوٹ ہے جسم تو ایک سواری تھی، سوار اس میں سے نکل کر غیر فانی دنیا میں چلا گیا پھر ہم اس جسم کو مٹی کی نظر کر دیتے ہیں کیوں کہ وہ مٹی سے ہی بنا اور مٹی میں ہی چلا گیا۔ ہم جو زندگی گزار رہے ہیں وہ اصل نہیں ہے اس پر ایک شخص سوال کرتا ہے:

''ساری کتابیں، سارے علوم، سارے فنون بھی تو اصل نہیں؟''[۱۳]

وہ جواب دیتا ہے کہ:

''اصل صرف وہ ہے، جسے کوئی ڈھونڈ تا نہیں اُسے پا لو گے تو سمجھو اصل تمھیں مل گیا۔ تم سارے اس کے پھیلاؤ میں گم ہو۔''[۱۴]

اس افسانے میں یہ شخص جو وسیع المطالعہ رکھتا ہے وہ یہ بتانا چاہ رہا ہے کہ تم نے اپنے اندر جھانکنا ہے اپنے اندر کی دنیا کو تلاش کرنا ہے کسی ایک نقطے کو ڈھونڈ نا ہے تو تمھیں تمھارا اصل مل جائے گا اور یہی شخص اپنے وسیع علم کا دعوی کرتے ہوئے گویا ہوتا ہے کہ:

''نہیں نہیں، یہ روح نہیں کئی اجسام ہیں، تم نے اصل پانا ہے تو پہلے نکتے کو ڈھونڈو۔ نکتہ وسیع دنیا میں ایک نکتے کے برابر ہے۔ اُسی نکتے میں طاقت کے سارے سرچشمے ہیں۔ وہاں ارتعاش ہے، حرکت ہے، آندھیوں کی تیز ہوائیں ہیں، ان ہواؤں، میں آوازوں کی بازگشت ہے، آوازوں کو سنو! تب جان جاؤ گے اصل کیا ہے۔''[۱۵]

مصنف نے افسانے کے آخر میں یہ بتایا ہے کہ جو شخص اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے اس کا جسم باقی رہ جاتا ہے روح نکل جاتی ہے تم اس کو دیکھ کے روتے ہو یہ سب جھوٹ ہے اصل صرف وہی ہے جس کی تم پہچان کر لو گے تب تمھیں سکون میسر آئے گا اور تمھارے ہاتھ میں وہی کچھ ہوتا ہے جتنا اللہ تعالیٰ نے تمہیں دیا ہوتا ہے اس سے آگے سب الجھاؤ ہے اور اسی افسانے کے آخر میں یہی کردار مدلل گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے:

''جب اصل ملے گا تب سکون اور ٹھہراؤ پاؤ گے، تمہاری دسترس میں اتنا ہی ہے، جتنا تمہیں ودیعت کیا گیا ہے، اس کے آگے اُلجھاؤ ہے۔ بے بسی، بے چارگی، درماندگی ہے۔ اصل تک رسائی سے سب قاصر ہیں، قاصر ہیں، قاصر ہیں۔''[16]

اس افسانے میں فلسفیانہ انداز گفتگو کو برت کر اپنے آپ کو پہچاننا اور خدا کو پہچاننے کے اوپر گفتگو کی گئی ہے اور سوچنے پر اور اپنا اصل تلاش کرنے پر اُکسایا گیا ہے۔ مصنف قاری کو عرفانِ ذات کا ادراک کرواتا ہے کہ جو زندگی ہم گزار رہے ہیں وہ اصل ہے یا سب نقلی اور اس افسانے میں صوفیانہ آہنگ پایا جاتا ہے کہ انسان کو اپنی کھوج کس طرح کرنی ہے۔ صوفیا کا مقولہ ہے: مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ۔ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا تو تحقیق اُس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔ یہ افسانہ عرفانِ نفس کے ذریعے عرفانِ الٰہی پر زور دیتا ہے۔

افسانہ ''**مکافاتِ عمل**'' یہ نام سے ہی ظاہر ہے کہ گناہ کی سزا اس افسانے میں ایک ایسے شخص کی کہانی ہے، جس سے ایک عورت حد درجہ پیار کرتی ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتی ہے لیکن ملک وقار اس سے کوئی پیار نہیں کرتا تھا وہ صرف وقت گزاری کرتا تھا وہ عورت اس سے بے پناہ محبت کرتی ہے اور اُس سے یہ کہتی ہے:

''دیکھو مجھے نہ چھوڑو، میں تم سے محبت کرتی ہوں، تمہارے بن نہیں رہ پاؤں گی۔''[17]

اس کے جواب میں ملک وقار یوں کہتا ہے:

''یہ سب جھوٹ ہے تمہیں کسی سے محبت نہیں، تم جیسی عورتیں کسی کی بھی نہیں ہوتی اور نہ ہی محبت جیسے جذبے کو سمجھ سکتیں ہیں۔''[18]

کسی شخص کو اس طرح بُرا بھلا نہیں کہنا چاہیے کہ بعد میں اُسے پچھتانا پڑے وہ اس عورت کے جسم سے حظ اُٹھاتا لیکن جب وہ اُسے شادی کا کہتی وہ انکار کر دیتا اور اُسے جو منہ میں آتا کہہ دیتا۔ اخلاق سب سے بڑی چیز ہے وہ اسے آرام سے بھی کہہ سکتا تھا لیکن اُس نے ایسا ہرگز نہیں کیا ایک دن جب اُس عورت نے ملک وقار سے شادی کا کہا تو ملک وقار نے بے عزت کیا اور انتہائی غلیظ گالیوں سے اُسے خود سے دور کرنا چاہا اور وہ عورت آنسو بہاتے ہوئے

بددعائیں دینے لگی۔

ملک وقار نے ایک سیاسی عورت سے شادی کر لی، جس کا اثر رسوخ بہت زیادہ تھا اور انتہائی سکون کی زندگی گزار رہا تھا اور زندگی کی تمام سہولیات اُسے میسر آ گئیں تھیں لیکن اصل واقعہ اس وقت پیش آیا جب سانحہ ۸ اکتوبر ۲۰۰۵ء کا زلزلہ برپا ہوا، جس میں بہت سے علاقے مٹی کا ڈھیر ہو گئے اور بہت سے لوگ شہید اور زخمی ہو گئے ان میں اس کی بیوی اور دو بچے بھی تھے ملک وقار نے ڈھونڈنا شروع کیا لیکن اُسے تسلی بخش نتائج نہیں ملے اچانک کسی نے بتایا کہ دو بچے اٹک کیمپ میں منتقل کر دیے گئے ہیں ملک وقار ان تک پہنچ جاتا ہے وہاں ایک عورت اس کے بچوں کی مرہم پٹی کر رہی تھی۔ ملک وقار اس سماجی کارکن کو یوں مخاطب کرتا ہے:

''تم انسان نہیں فرشتہ ہو، تم جیسی فرشتہ سیرت ہی لوگوں کے زخموں پر پھاہا رکھتی ہیں۔ اس سماج کو تم جیسی ہی عورتوں کی ضرورت ہے۔''[۱۹]

یہ وہی عورت تھی جس کو ملک وقار نے بے شرم، بے حیا کہا تھا اور معاشرے پر بوجھ کہا لیکن اس خاتون نے اس کے بچوں کی جان بچائی جب وہ عورت پیچھے مُڑی تو ملک وقار کو وہ سارے الفاظ ایک طمانچے کی صورت میں اُس کے چہرے پر لگتے محسوس ہوئے۔ اگر اُسے خاتون سے محبت نہیں تھی تو وہ اُسے ذلیل وخوار نہ کرتا، ذلیل وخوار کرنا انسانیت کے زمرے میں نہیں آتا۔ اخلاق کو کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے اور کسی سے ایسے الفاظ نہیں استعمال کرنے چاہیے کہ بعد میں شرمندہ ہونا پڑے۔ اس افسانے میں بھی یہی بات بتائی گئی ہے کہ کسی کے ساتھ بُرا نہ کریں، ہر ایک سے اخلاق سے پیش آئیں ہم اس دنیا میں آئے ہیں اور ایک دن جانا بھی ہے یہ دنیا مکافاتِ عمل ہے یہاں ہر شخص کو اپنے کیے کا حساب دینا ہے۔ ہر دھوکے، ہر فریب، ہر ظلم، ہر جھوٹ، ہر تکلیف، ہر اذیت جو وہ کسی کو دیتا ہے اُسے اپنی ذات پر بھگتنا ہے۔ اسے ہر غلط ارادے، غلط سوچ، غلط عمل کا حساب دینا ہے۔ ایک ضرب المثل بہت مشہور ہے:

از مکافات عمل غافل مشو
گندم از گندم بروید جو از جو

افسانہ ''دائرے کا اسیر'' میں اگلے جہاں کو بہت خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ اس افسانے کا مقصد یہ ہے کہ دنیا میں اچھے اعمال کریں کیوں کہ مٹی میں جانا ہی ہے تو ایسی زندگی بسر کریں جس کے لیے بھیجا گیا ہے۔ اس

افسانے میں مصنف کا دل ودماغ دنیا کی تباہی، تاریکیوں، مایوسیوں سے بھرا پڑا ہے، جس کی وجہ سے نہ اُسے جسمانی سکون ہے اور نہ ہی ذہنی آسودگی ہے اور نہ ہی کسی چیز میں دلچسپی رکھتا ہے۔ ہمیشہ عجیب وغریب بے چینی میں رہتا ہے دنیا میں ناانصافیوں اور ناہمواریوں کی وجہ سے وہ کہتا ہے کہ انسان ایک ہے لیکن اس کی فطرتیں کئی قسم کی ہیں۔ جیسے انھوں نے ہی کہا ہے:

''وہاں کتے بھونک رہے تھے، چوزے کے پیچھے بلوٹا اور بلوٹے کے پیچھے پلا بھاگ رہا تھا، بچھیرا بچھیری کو پکڑنے کی کوشش میں تھا وہ سرپٹ دوڑ رہی تھی، سامنے لومڑیاں آپس میں چھیڑخانی کر رہی تھیں، بندر انہیں دیکھ کر محظوظ ہو رہے تھے، چڑیا شور مچا رہی تھیں، کوئے اپنی دنیا میں مگن تھے، گدھے لمبی تانے سو رہے تھے۔ قدرے دور جانب سور بھی کھڑے تھے۔ جب کتے زور سے بھونکنا شروع ہوئے تو میرے اندر بیٹھا کتا بھی جاگ اُٹھا اور بھونکنے لگا۔''[۲۰]

اس دنیا میں انسانوں کی شکل میں جانور بھی رہائش پذیر ہیں اس لیے وہ انسانوں کو جانوروں سے بدترین سمجھتا ہے اس نے ذکر کیا ہے کہ ناسمجھی، ناعقلی اور سوچے بغیر جو بھی کام کیا جاتا ہے وہ انسانوں کا نہیں جانووروں کا ہے، اِسی لیے ایک انسان نے سوچے سمجھے، بغیر غور کیے اور جانوروں کی زندگیوں کو بے وقعت اور بے قیمتی سمجھتے ہوئے ایک کتے کو جان سے مار دیا چند اور بے وقوفوں نے جانوروں کی طرح بغیر سوچے سمجھے اور تدبیر کیے، اور بغیر عقل کو کام میں لاتے ہوئے تین انسانوں یعنی اشرف المخلوقات کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ انسانوں کی صفت نہیں ہے یہ سوروں درندوں کی خصلتیں ہیں اور کتے، بھیڑیے اور خون خوار درندوں کی طرح یہ انسان بھی درندے ہیں لیکن انسانی شکل میں معاشرے کا بیڑا غرق کرتے ہیں دین، دنیا اور آخرت کا انجام سوچے سمجھے بغیر دن دھاڑے جب چاہیں درندوں جیسا انسانی معاشرے کے ساتھ سلوک کرتے ہیں۔

مصنف کے اندر بھی کئی قسم کے خصلتوں والے درندے موجود ہیں، جن میں سے خاص طور پر اُس نے اپنے اندر کے کتے کا ذکر کیا ہے دراصل حقیقت یہ ہے کہ نہ انسان کے اندر کوئی کتا، درندہ اور نہ ہی شیطان ہوتا ہے بل کہ انسانوں کے کیے ہوئے کئی قسم کے گناہ کبھی سور، کبھی بھیڑیے، کبھی کتے اور دوسرے خون خوار جانوروں کی صورت میں نظر آتے ہیں یہ اس کے بداعمال ہیں جو اُسے نظر آتے ہیں جس سے انسان کا وجود ہمیشہ سوچنے کو مضطرب رہتا ہے۔ آگے چل کر مصنف نے جس لمبے تڑنگے، بدنما جسم والے اور بغیر چہرہ کے انسان کو اپنا تعاقب کرتے ہوئے دیکھا

ہے حقیقت میں وہ بھی ایک بڑے اور خطرناک قسم کا اس کا گناہ ہے، جو اس کا پیچھا کر رہا ہے۔مصنف نے اپنی سوچ اور سمجھ کے مطابق اگلی دنیا کا بھی ذکر کیا ہے اور شاعتِ اعمال کا تذکرہ بھی کیا ہے قبر نہ تو دوزخ کا گڑھا ہے نہ جنت کا باغ مگر اِنسانی اعمال اسے ایسا بنا دیتے ہیں۔کس خوبصورتی سے وہ اس حقیقت کو عیاں کرتے ہیں:

> ''سامنے ایک نئی قبر کھود دی گئی تھی ،نئی ہونے کے باوجود شکستگی عیاں تھی ،اطراف میں
> لگائے گئے تہہ در تہہ پتھر ذرہ بھی خوبصورت نہ تھے اُن میں سوراخ دیکھ کر میں تو گھبرا
> گیا۔میرے اندر اندھیرا پھیلنے لگا جسم میں بے چینی سرایت کر گئی ،میں اداس ہو گیا۔
> ایسے لگا جیسے کلیجہ حلق میں اٹکا ہوا ہو۔''۲۱

یعنی اس دنیا میں رہتے ہوئے ہم نے اگلی دنیا کا زیادہ خیال رکھنا ہے۔اس دنیا میں کوئی ایسا کام نہ کریں کہ اگلی دنیا میں جا کر مایوسی کا سامنا کرنا پڑے اس کے لیے نیک عمل کرنے کی ضرورت ہے خدا کی مخلوق کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کریں تا کہ اگلی دنیا میں جہاں ہم نے ہمیشہ رہنا ہے ہمارے کام آئے۔مصنف نے آگے چل کر چند اور قبروں کا ذکر بھی کیا ہے جس میں ایک قبر حاصل کرنے کی خواہش بھی کی ہے لیکن اُس کی خواہش اور مرضی کو یکسر رد کر دیا گیا کہ تم یہاں نہیں رہ سکتے ۔مصنف نے چند سکے اپنی جیب سے نکالے اور پیشکش کی لیکن اُس سے کہا گیا یہ تمھارے رہنے کی جگہ نہیں یعنی یہ سکے دراصل تمھارے نیک اعمال ہیں جو تمھارے پاس نہیں ہیں۔لہٰذا تم اس جگہ نہیں رہ سکتے یہ نیک لوگوں کی جگہ ہے جب اُسے صاف صاف جواب مل گیا تو اُس نے آرام و عافیت بھاگ جانے میں پائی۔لیکن اُس عجیب مخلوق نے جو اس کے گناہ تھے اس کو اپنی گرفت میں جکڑ لیا جس سے وہ خود کو چھڑا نہ سکا اگلی دنیا کے خیال میں اُسے جو چند پاک دامن اور خوبصورت عورتیں دکھائی دیں وہ جنت کی حوریں ہیں جو نیک لوگوں کی امانت ہیں۔ بد اعمالوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں اس کے علاوہ کچھ لوگ تختوں پر بیٹھے ہوئے دیکھے جنہوں نے اس کی چیخ و پکار پر کوئی دھیان نہ دیا، نہ ہمدردی کا اظہار کیا اور نہ ہی چھڑانے کی کوشش کی حقیقت میں وہ جنتی لوگ ہیں جو تختوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہیں انھوں نے دنیا میں نیک اعمال کیے، اللہ تعالیٰ نے اُن کا نیک صلہ دیا جیسے کہ قرآن پاک کے پارہ ۲۳ میں سورہ یٰس کی آیت نمبر ۵۵، ۵۶ میں اس کا ذکر تفصیل کے ساتھ آیا ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے:

> ''جنتی لوگ آج کے دن اپنے (دلچسپ) مشغلوں میں ہشاش بشاش ہیں (۵۵) وہ
> اور ان کی بیویاں سایوں میں مسہریوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے (۵۶)''۲۲

آخر کار گناہوں کے زیادہ ہونے کی وجہ سے اُسے گناہوں کے ڈھیر پر پھینک دیا گیا جہاں اس کا کوئی یارومدد گار نہ تھا لیکن خدا نے اس کو وہاں بھی تنہا نہیں چھوڑا اس کی تسکین اور ذہنی سکون کے لیے ایک صاف چہرہ اس کے سامنے لاکر وسیع وعریض شاندار صاف فرش پر لا کھڑا کر دیا اس انسان سے مصنف کو تسکین دی اور کہا کہ تم اس بے چہرہ انسان سے بچ نہیں سکتے اور نہ ہی تمہارے یہ سکے کام آئیں گے جو تم نے پیش کیے ہیں۔ حقیقت میں وہ بے چہرہ آدمی کوئی مخلوق نہیں ہے بل کہ اُس کے گناہوں کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ یہ روشن چہرہ شخص اس سے کہتا ہے:

> ''تم نے صرف ایک نقطے میں ساری زندگی گزاری تھی، اس نقطے کی زندگی نے آج تمھیں دائرے میں ذلیل ورسوا کر دیا۔ وہ وقت جس کی پاداش میں تم ٹھوکریں کھا رہے ہو، صرف ایک ساعت تھی تم اس ساعت کے امتحان میں پیچھے رہ گئے ہو۔''۲۳

اس کے علاوہ جب مصنف نے دوسری طرف دیکھا تو یہ دیکھ کر حیران پریشان ہو گیا کہ اُسی کی شکل کا ایک انسان اُس کے سامنے کھڑا ہے اس نے محسوس کیا یہ انسان تو میں ہی ہوں اور اپنا عکس آئینے کی شکل میں تو دیکھ رہا ہوں حقیقت میں یہ اُس جیسی اس کی پاک صاف، شفاف بے جسم روح تھی۔ جیسے بدن کو تو فنا ہے لیکن روح کو فنا نہیں ہے اور آخر میں وہ روشن چہرہ انسان جا چکا ہوتا ہے اور مصنف تنہا رہ جاتا ہے اور اس طرح محسوس کرتا ہے:

> ''میں دائرے میں کھڑا تھا۔ یہ دائرہ ایک اور دائرے میں ضم اور وہ دائرہ ایک اور دائرے میں ختم، ہر دائرے کے بعد ایک اور دائرہ، تا حد نظر یہ سلسلہ جاری تھا سارے تماشائی جا چکے تھے۔''۲۴

اس لیے دنیا کو ہی سب کچھ سمجھ لینا سب سے بڑی بے وقوفی ہے دنیا میں اچھے اور نیک اعمال کریں تا کہ آخرت میں ذلیل ورسوا نہ ہوں اور ہمارا شمار بھی نیک لوگوں میں ہو یہ جنت ہمارے لیے ہے اور یہ اسی کو ملے گی جو اس کا مستحق ہوگا۔

افسانہ ''کل مونہی'' میں ایک عورت کی کہانی بیان کی گئی ہے جو اپنا گھر بار چھوڑ کر ایک شخص کے پیچھے چلی جاتی ہے۔ عورت کے کئی روپ ہیں لیکن عورت پر معاشرے کا بہت بڑا اثر پڑتا ہے اور اس معاشرے میں ایسے لوگ بتائے

ہیں جو دنیا میں اچھے بھی ہیں اور بُرے بھی ہیں کچھ دُکھ دیتے ہیں اور کچھ دُکھ بانٹتے ہیں اور کئی ایسے بھی ہیں جو صرف اپنا مفاد چاہتے ہیں جب صداقت نے اپنے دوست سے کہا کہ:

''یہاں ہر کوئی صرف زخم دینا جانتا ہے کوئی کسی کے زخموں پہ پھاہا نہیں رکھتا۔'' ۲۵

تو اس کا دوست اس سے کہتا ہے:

''دنیا میں اچھے بُرے سب بستے ہیں اُن لوگوں کی کمی نہیں جو زخموں پر مرہم لگاتے ہیں اور ایسے لوگ بھی ہیں جو زخم اُدھیڑ کر نمک پاشی کرتے ہیں، وہ بھی ہیں جو اپنا فائدہ چھوڑ کر دوسروں کے کام کر جاتے ہیں ایسے بھی بہت ہیں جو صرف اپنے ہی فائدے پر نثار رہتے ہیں، بس اچھا رویہ اور مثبت سوچ انسان کو انسانی معراج تک پہنچا دیتی ہے۔'' ۲۶

اس افسانے میں صداقت نائلہ سے محبت کرتا ہے اور شادی کرنا چاہتا ہے لیکن صداقت کے گھر والے نہیں مانتے وہ اُسے بھاگ کر شادی کرنے پر اُکساتا ہے اور وہ یہ نہیں سوچ پاتی کہ میں محبت میں قدم رکھوں یا نہ رکھوں، ماں باپ کی عزت، خاندان کی عزت رکھوں یا نہ رکھوں۔ ویسے بھی فطرتی طور پر عورت کا ذہن ناپختہ اور ناتجربہ کار ہوتا ہے اگر گھر کے بڑے اپنے بچوں پر کڑی نظر رکھیں، بے جا لاڈ پیار نہ کریں تو اولاد خود سر نہیں ہو سکتی اور نہ ہی اپنی من مانی کر سکتی ہے۔

ناتجربہ کار ہونے کی وجہ سے کم عملی اور کم عقلی کی وجہ سے نائلہ نے اپنی منگنی ہونے کے باوجود خاندان کے کئی با وقار افراد کو بمعہ والدین ٹھکرا کر واحد ایک شخص کے پیچھے لگ گئی اور ماں باپ کی، خاندان اور رشتہ داروں کی عزت کو خاک میں ملا کر ایک شخص صداقت کی باتوں میں آ کر اس کے ساتھ رشتہ ازدواج جوڑ لیا۔

اس افسانے میں صداقت ناشکری کا اظہار کرتا ہے کیوں کہ وہ بیٹیوں کی پیدائش سے ناخوش ہے اور ہر وقت نائلہ کو کوستا رہتا اور بُرا بھلا کہتا اور لڑائی آئے روز کا معمول بن گیا۔ وہ بیٹیوں کے پیدا ہونے کی وجہ سے خدا کے حکم میں دخل اندازی کرنا، ناشکری کرنا، ناراضگی کا اظہار کرنا، بیوی کو تھپڑ مارنا اور اُسے معاشرے میں جائز مقام نہ دینا، اپنی بچیوں کو والد کے پیار سے محروم رکھنا، گھر میں دلچسپی نہ رکھنا قیامت سے پہلے بیوی اور بچوں پر قیامت برپا کرنا کوئی عقل

مندی کی بات نہیں اور اللہ تعالیٰ سے ناشکری کا اظہار بالکل نہیں کرنا چاہیے اُس کے دیے پر ہر حال میں شکر بجالانا چاہیے مگر آج کل ایسا ہی ہو رہا ہے لوگ اللہ تعالیٰ کا شکرادانہیں کرتے اور ہر وقت اپنے حال اور مستقبل کو کوستے رہتے ہیں۔

صداقت نے دوسری شادی کرلی تھی اور وہ زیادہ دوسری بیوی میں ہی دلچسپی لینے لگا جو اُس نے دوسری شادی کی وہ اس کا حق ہے لیکن پُرانی بیوی اور بچیوں سے محبت کرنا، اُن کی ضروریات کو مدِنظر رکھنا، اُن کا خیال رکھنا یہ بھی اس کا ایک اخلاقی فرض بنتا ہے۔ لیکن اُس نے ان سب حقوق سے انہیں محروم رکھا تھا مصنف نے معاشرے کی ایسی بُرائی سامنے لائی ہے جو آئے روز کسی نہ کسی گھر میں رونما ہو رہی ہے۔

یہی واقعہ نائلہ کی بیٹی صاعقہ کے ساتھ بھی ہوا اس کا عاشق بھی اُسے گھر سے بھاگنے پر مجبور کر رہا تھا لیکن آخر میں مصنف نے عورت کو بُرا کہنے سے خوبصورتی سے بچا لیا ہے کہ اُس نے اپنے چاہنے والے کو دوٹوک لفظوں میں پیغام بھیج دیا کہ میں اپنے والدین کی عزت و ناموس اور وقار کو خاک میں ہرگز ملانا نہیں چاہتی اگر آپ نے میرے ساتھ شادی کرنی ہے تو دونوں خاندان کو محبت میں پرونے اور اچھے تعلقات برقرار رکھنے کے طریقے اپنانے ہوں گے اور وہ یہ طریقہ ہے کہ اپنے والدین کو میرے والدین کے پاس رشتہ مانگنے کے لیے بھیج دیں اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے تو پھر میں ایسا نہیں کرتی۔ وہ کچھ اس طرح کہتی ہے:

> ''سلام میں اپنی خوشی کی خاطر اپنی ماں کا اعتبار اور بہنوں کا مستقبل کسی طور داؤ پر نہیں لگا سکتی۔ میرا سب کچھ میری ماں اور بہنیں ہیں اگر آپ کو واقعی مجھ سے محبت ہے تو اپنے والدین کو راضی کریں اور امی کو ہمارے ہاں بھیجیں ورنہ مجھے ہمیشہ کے لیے بھول جائیں میں زندگی کی شروعات ابھاگن کے طور پر نہیں کرنا چاہتی۔'' ۲۷

اس افسانے میں مصنف نے معاشرے میں ایک ایسے شخص کی کہانی بیان کی ہے جو ناشکری کرتا ہے اللہ کے دیے پر ناراضگی کا اظہار کرتا ہے اور ایسی عورت کو پیش کیا ہے جو ہمارے معاشرے سے تعلق رکھتی ہے وہ اپنا سب کچھ چھوڑ کر ایک شخص کے ساتھ اپنی زندگی گزارنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ انھوں نے اپنے گہرے مشاہدے سے اس کہانی کو تخلیق کیا اور عورت کی کمزوری کو قارئین کے سامنے لایا۔

افسانہ ''تعاقب'' میں مصنف نے ایک خواب کے ذریعے اپنی فکر کو سامنے لایا ہے خواب ہمیشہ انسان کے ذہن میں اُس وقت پیدا ہوتے ہیں جب کسی کا ذہن دن کے وقت کئی مسائل کا شکار ہو دن کے وقت کی تمام کیفیات،

حالات وواقعات،نشیب وفراز رات کوخوابوں کی صورت میں نظر آتے ہیں یہ ضروری نہیں کہ ہر خواب سچا ہو یا اس کی کوئی صحیح تعبیر بتا سکے عام لوگوں کا خیال ہے کہ اچھے یا بُرے ڈراونے خواب اس شخص کی ذہنی کیفیت کا نام ہے کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے ایک آدھ خواب ان میں سے ممکن ہے سچ بھی ہو جائے لیکن ہمیں خواب دیکھنے کے بعد اُس کے اچھے یا بُرے کا نتیجہ ظاہر ہونے سے ہرگز پریشان نہیں ہونا چاہیے۔

اس افسانے میں مصنف نے ایک شخص کی ذہنی کیفیت،اس کی نفسیات اور آئے روز جو الجھن کا شکار رہتا ہے ہمارے سامنے لا کھڑا کیا اور معاشرے میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو ایسا محسوس کرتے ہیں کہ بہت بڑے دُکھ، پریشانیاں اور مسائل اس کا پیچھا کر رہے ہیں جس وجہ سے اس کے ذہن میں طرح طرح کے خیال آتے ہیں اور اسی وجہ سے ذہنی الجھن کا شکار رہتا ہے اس افسانے میں ایک شخص کو ڈراؤنے خواب آتے ہیں جس میں وہ دنیا کو تباہ و برباد ہوتے دیکھتا ہے اور اپنے عزیز و اقارب کو مرتے ہوئے دیکھتا ہے اور اس کی ذہنی کیفیت ایسی ہوتی ہے کہ وہ کبھی واش بیسن سے خون نکلتے ہوئے محسوس کرتا ہے۔ وہ اپنا خواب اپنے دوست کو بھی بتا تا ہے لیکن وہ یقین نہیں کرتا اس کے علاوہ اس شخص کی ذہنی کیفیت کو دیکھ کر عالموں اور ڈاکٹروں سے اس کا علاج کروایا جاتا ہے لیکن اُسے کوئی ذہنی سکون اور افاقہ نہیں ہوتا وہ اپنے اسی خواب کو سوچتا رہتا ہے جو اس نے بچپن میں دیکھا تھا وہ نفسیاتی طور پر بالکل اسی خواب کا قیدی بن گیا تھا۔لیکن یہ ضروری نہیں کہ خواب دیکھ کر اس کا نتیجہ اچھی یا بُری صورت میں ضرور نکلے گا لیکن یہ خیال ان کا غلط ہے کیوں کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے کہ اس نے ہر شے کا وقت مقرر کر رکھا ہے جس کا ہمیں قطعاً پہلے علم نہیں ہوتا جب تک اس کی طرف سے اشارہ نہ ہو۔

اس افسانے میں یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد یا قریبی رشتہ دار اس دنیا سے چلے گئے ہیں ان کی اولاد اللہ تعالیٰ نے انہی کے سبب پیدا کی ہے لہاذا ان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد آنسو بہانے سے بہتر ہے کہ ان کے لیے دعائے مغفرت کی جائے اور نئی نسل کو اپنے آباؤ اجداد اور قریبی رشتہ دار جو اس فانی دنیا سے کوچ کر گئے ہیں کبھی نہیں بھولنا چاہیے مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان کے نام کی صدقہ وخیرات کرنی چاہیے تا کہ موجودہ نسل میں یہ رواج پختہ ہو جائے کہ جب موجودہ بوڑھے والدین اس دنیا سے کوچ کر جائیں تو خیرات اور صدقات کا سلسلہ جاری رہے مصنف نے اس خیال کو یوں پیش کیا ہے کہ اس شخص کی بیوی اس سے کہتی ہے:

> ''ہمیں اپنے پیاروں کی میتوں کا پیچھا کرنا چاہیے ان کو یاد رکھنا چاہیے ان کے لیے دعا کا اہتمام کرنا چاہیے اتنا تو ہم آسانی سے ہر وقت کر سکتے ہیں۔''[۲۸]

آخر میں مصنف نے اپنے افسانے کو جہاں سے شروع کیا تھا وہیں انہی قدموں پر ختم کر دیا اچانک اس کی سب سے پہلی ڈراؤنی خواب کی تعبیر سچ ہوگئی وہ خواب جو برسوں سے اس کا پیچھا کر رہا تھا جس نے اُسے ذہنی الجھاؤ میں ڈالے رکھا تھا وہ سب اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔اس نے اپنی آخری زندگی میں ماں باپ، بیوی، بچوں اور رشتہ داروں کو زلزلے کے تباہ کن جھٹکوں نے لقمہ اجل کر دیا مکانات، پہاڑ، دیواریں، اونچی اونچی عمارتیں اس کی آنکھوں کے سامنے ملبے کا ڈھیر بن گئیں۔

ہم اس سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ بلا وجہ کسی پریشانی کو خود پر مسلط نہیں کرنا چاہیے اس سے نفسیاتی طور پر آدمی ذہنی اُلجھاؤ کا شکار رہتا ہے سب کچھ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے وہ جو کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے اس لیے اپنے معاملات کو اللہ کے سپرد کرنا چاہیے۔

افسانہ ''زمین سکڑ رہی ہے'' معاشرے میں ہونے والی بُرائیوں کو پیش کرتا ہے اس افسانے میں افسانہ نگار کا خیال کسی ایک چیز پہ نہیں ٹھہرتا۔ وہ بڑی پریشانی اور اُداسی میں ہے کرے تو کیا کرے جائے تو کہاں جائے ہر طرف اُداسی، مایوسی اور نا اُمیدی کے اندھیرے چھائے ہوئے ہیں۔ وہ خود کلامی کرتے ہوئے کہتا ہے:

> ''میں پہاڑی پر بیٹھا ہوں، نہیں کسی جنگل میں گھوم رہا ہوں، نہیں کسی دریا میں ڈبلیاں کھا رہا ہوں، نہیں کسی میدان میں کھڑا ہوں، نہیں صحرا میں ریت کھنگال رہا ہوں، نہیں کسی بستی میں محض ایک تماشہ بین کی طرح محظوظ ہو رہا ہوں۔ نہیں نہیں، میں کہیں میں بھی نہیں ہوں، مگر کہاں؟ مجھے معلوم نہیں۔''۲۹

مصنف موجودہ دور کے پیروں، فقیروں، حاکموں، مذہبی سکالروں سب کو بے رہرو دیکھتا ہے اگر کوئی ذہنی سکون کے لیے کسی رہبر کے پاس جائے تو اس کی رہبری نہیں ملتی بل کہ دھوکا اور فریب ملتا ہے جیسے کہ اس افسانے میں معاشرے میں ہر فرد کا چہرہ دکھایا ہے سچ کہیں بھی دکھائی نہیں دیتا ہر طرف جھوٹ اور ظلم و بربریت برپا ہے انصاف کرنے والا کوئی نہیں ہے انسانیت بالکل ختم ہو چکی ہے دن دیہاڑے ایک دوسرے کا خون بہایا جاتا ہے بھائی بھائی کا دشمن بنا ہوا ہے جہاں جائیں وہاں دھوکہ دہی، جھوٹ، فریب نے اپنے ڈھیرے جمائے ہوئے ہیں۔اس ضمن میں علامہ اقبال نے کیا خوب فرمایا ہے؛

''خداوندا یہ تیرے سادہ لوح بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیّاری ہے، سلطانی بھی عیّاری''۳۰؎

مصنف نے معاشرے کی نبض پر ہاتھ رکھا ہے ایک ہونہار اور سمجھدار لڑکی نے اپنا حق دوسروں کو دینے سے انکار کیا تو اسے اس کی بہت بڑی سزا دی گئی کہ اُس کے چہرے پر تیزاب پھینک کر اس کا چہرہ مسخ کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بیچاری لڑکی معاشرے کے رویے سے تنگ آ کر اپنا گھر بار چھوڑ کر در بدر کی ٹھوکریں کھانے لگی اور معاشرے نے اس کا سکھ، چین سب کچھ چھین لیا یہ سب ایک زمین نہ دینے کی وجہ سے ہوا اس کے علاوہ مصنف نے معاشرے کی انتہائی قسم کی لالچ کا بھی ذکر کیا ہے اور ساتھ ساتھ ناانصافی کا ذکر کیا ہے کہ ایک آدمی نے اپنا سر چھپانے کے لیے کچھ زمین خریدی لیکن کچھ لوگوں کو اس کا یہ نیک کام پسند نہ آیا اس کے ساتھ لڑائی جھگڑا شروع کیا اس نے اپنے خون پسینے کی کمائی سے حاصل کردہ زمین لوٹانا چاہی لیکن اس کی بیوی آئے روز جھگڑ پڑتی اور کہتی:

''زمین کم پڑتی جا رہی ہے اور تم اس کے بارے میں کچھ نہیں سوچتے۔''۳۱؎

اپنے شوہر کو طعنے دیتی اور یہ کہتی:

''وہ بھی کوئی مرد ہے جس کے پاس سر چھپانے کے لیے اپنا گھر تک نہ ہو۔''۳۲؎

اس افسانے میں اس عورت کو پیش کیا گیا ہے جسے آئے روز زمین کم پڑتی دکھائی دے رہی تھی اور اپنے شوہر کو طعنے دیتی کہ سر چھپانے کے لیے زمین کا ہونا لازمی ہے اور یہ زمین لوٹانے سے انکار کی پاداش میں اس آدمی کے بچوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا۔

مصنف نے بڑی دلیری سے اس معیوب عمل کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا اور تسلیم کیا کہ اس کی زندگی کے اردگرد جو مصیبتوں کا حصار ہے وہ اُسے نہیں توڑ سکے گا کیوں کہ سارے کا سارا معاشرہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے ماتحت ہے جہاں ایسی کیفیت ہو وہاں انصاف نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہتی اور رات دن اس کی زندگی اور خوابوں کی زندگی کے لیے زمین سکڑتی رہتی ہے۔

آخر میں مصنف اس بات کا ذکر کرتا ہے کہ وہ حق اور سچ کے معاملے میں باطل قوتوں کے سامنے سیسہ پلائی

کی دیوار بن کر کھڑا ہوا ہے اور وہ معاشرے کی ہر بُرائی سے، ہر ناانصافی سے، ہر بے رہروی سے نالاں اور بے زار ہے لیکن حقیقت میں اس کے جذبات، احساس اور عقلمندی سے راستے پر چلنے کے تمام ذرائع بُرے معاشرے نے بند کر دیے ہیں جس کے دُکھ سے، تکلیف سے، کرب سے اس کا کلیجہ باہر آ گیا۔ خون رگوں میں دوڑنے کے بجائے پانی بن کر جسم کو چھوڑ کر باہر آ گیا ہے اور اسے خون میں لت پت کر دیا ہے۔

یہ افسانہ مختلف موضوعات سمیٹے ہوئے ہے لیکن اس کا جولبِ لباب ہے جو مرکزی نقطہ ہے وہ یہی ہے کہ لوگوں کے اندر مادیت پسندی آ رہی ہے ہر چیز جو ہر شخص حاصل کرنا چاہتا ہے جس کی وجہ سے وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ زمین کم پڑ رہی ہے انسان اپنے اندر سے مادیت پسندی کے جراثیم ختم کرے گا تب ہی معاشرہ امن وسکون سے ہمکنار ہوگا اور اس طرح کے واقعات رونما نہیں ہوں گے۔

افسانہ ''سراغ'' خود کی تلاش پر مبنی ہے اپنے آپ کو ڈھونڈنا اور اس کی کھوج لگانے کا درس دیتا ہے۔ اس افسانے میں مصنف ایک منتشر خیال میں ڈوبا ہوا ہے کبھی وہ اپنے آپ کو سایہ کہتا ہے اور کبھی سایہ کو اپنا آپ کہتا ہے دونوں میں فرق محسوس نہیں کر سکتا وہ خود کو تلاش کرنے میں دشواری محسوس کر رہا ہے۔ اور کچھ یوں کہتا ہے:

> ''غیر ارادی طور پر جب میں نے اپنے اندر جھانکا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ میں اپنی ہی آنکھوں سے دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ میں نے اپنے اندر جھانکا، چاروں طرف سیاہی ہی سیاہی تھی، گہری تاریکی دیکھ کر ایک انجانے خوف سے میرا وجود تھرا اُٹھا۔''۳۳

مصنف اس پریشانی کا بھی شکار ہے کہ وہ رات اور دن میں مکمل تمیز بھی نہیں کر سکتا کیوں کہ آنکھیں صحیح سلامت ہونے کے باوجود اُسے کچھ نظر نہیں آ رہا یہ اس کے اندر گھپ اندھیرا ہے کیوں کہ وہ آنکھوں کے ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں کو گڑھا کہہ رہا ہے۔ دراصل وہ اپنے باطن کی کھوج نہیں کر پا رہا اور اس مایوسی کا اظہار کر رہا ہے بار بار وہ آئینے کے پاس جاتا ہے اور ایک خواب کی سی کیفیت محسوس کرتا ہے اِسی لیے وہ اپنے بدن کو بار بار چھوتا ہے کہ کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا اس کا ذہن بھول بھلیوں میں پھنسا ہوا ہے وہ پریشانی کے عالم میں جنگل میں بھٹک رہا تھا جنگل کی کانٹے دار جھاڑیاں نہ چبھنے کے باوجود اس کے دل ودماغ کو زخمی کر رہی تھیں حالانکہ حقیقت میں نہ وہ جنگل میں جا رہا ہے نہ صحرا میں جا رہا ہے وہ مایوسی کے عالم میں آئینے کے سامنے کھڑا یہ محسوس کر رہا ہے کہ یہ میں ہی کھڑا ہوں یا کوئی اور آئینے کے سامنے کھڑا ہے وہ فرق محسوس نہیں کر رہا اور ایک عجیب سی کیفیت سے دوچار ہے۔ وہ یوں کچھ یوں محسوس کر

رہا ہے:

’تاریکی کے جنگل میں سفر جاری رکھنا محال ہو رہا تھا اس جنگل میں موجود خودرو خاردار جھاڑیوں کے کانٹے میرے جسم پر نشتر زنی کر رہے تھے۔تاریکی کی امر بیل میرے وجود کو جکڑ چکی تھی ، میرے لیے سفر کرنا محال ہو رہا تھا اور منزل کا تعین بھی ناممکن تھا۔‘‘۳۴

مصنف اب اپنے ماحول کی طرف واپس آ رہا ہے اس کو ایک نئی منزل کا اشارہ ملا ہے جس سے اس کی تھکن اور کمزوری میں کمی واقع ہوتی ہے کیوں کہ پہلے تو وہ منزل کا تعین کیے بغیر ہی اِدھر اُدھر سفر کر رہا تھا اب اس کو منزل کی سمت محسوس ہونے لگی۔آخر میں اپنی کہانی کو بڑا خوبصورت موڑ دے کر ختم کرنے کی کوشش کی ہے تنگ و تاریک گھڑا جو اس نے دیکھا وہ مایوسی کی نشانی ہے لیکن اُس کے ساتھ ہی جب اس نے سبزا اور شفاف پانی دیکھا تو اس کے دل میں خوشی کی لہر پیدا ہوئی اور وہ جانا کہ وہ پہلے خوابوں اور خیالوں کی دنیا میں بھٹکتا رہا ہے۔لیکن آخر کار اس نے کھوج پا لیا تھا اور اس جملے سے اس کی فکر کا اندازہ لگایا کا سکتا ہے:

’’میرے باطن کی آنکھ کیا کھلی کہ ہر سو اُجالا ہی اُجالا ہو گیا۔‘‘۳۵

جب اس کا ظاہر اور باطن آشنا ہو گیا تو اُسے اپنی منزل مل گئی اسی منزل کی تلاش میں وہ تھا کہ اُسے سکون مل جائے اور اس کا ظاہر اور باطن یعنی جسمانی اور روحانی خوشیاں اُسے مل گئیں۔

افسانہ ’’نئی کہانی‘‘ میں مصنف نے بہت سے واقعات کو پیش کیا ہے جو معاشرے کا حصہ ہیں۔اس افسانے میں مصنف سے اس کے کسی دوست نے یہ فرمائش کی کوئی ایسی کہانی لکھو جو دل و دماغ میں گھر کر لے اور بھولنے کا نام نہ لے اور جو ذہن میں دل و دماغ میں ایک قیامت برپا کر دے۔لیکن ایسی تو بے شمار کہانیاں لکھی جا چکی ہیں لکھی جا رہی ہیں اور لکھی جائیں گی جو معاشرے کے عین مطابق ہوں گی جن میں انصاف،لوگوں کی بربریت،حاکموں کا ظلم و تشدد بھی شامل ہوگا۔جب مصنف نے پوچھا کہ تمھیں کیسی کہانی پسند ہے تو اس کا ایک ہی جواب تھا:

''جو پڑھتے ہی دل میں اتر جائے اور دماغ میں ہلچل سی مچادے۔''۳۶

ہرایک انسان کی پیدائش سے لے کر وفات تک کوئی نہ کوئی کہانی ہوتی ہے جو پرانی اورنئی کہانیوں سے بالکل ملتی جلتی ہوتی ہے۔مصنف نے اس معاشرے کے ایسے گھرانوں کا ذکر کیا ہے جہاں بچے بھوک سے بلک رہے ہیں اور کسی کوان کی کوئی پرواہ نہیں مصنف بھی اسی ذہنی الجھن میں ہے کہ اگر ملک کی بدحالی اور پڑوس میں رہنے والوں کی بھوک اور تنگ دستی کے بارے میں لکھوں تو اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔کیوں کہ نہ باتوں سے اور نہ کہانیوں سے ان کی بھوک ختم کی جاسکتی ہے اور نہ ہی کچھ اور امداد کی جاسکتی ہے۔کیوں کہ حالات اور واقعات کچھ کر گزرنے سے بدلتے ہیں، اچھے ہوتے ہیں۔زبانی باتوں سے آج تک نہ کوئی فائدہ ہوا ہے اور نہ ہی آئندہ ہوگا۔علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

''عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے''۳۷

مصنف کے ذہن میں ایک نئی کہانی ابھری جو معاشرے کی عکاسی کرتی ہے کہ ایک خوبصورت دوشیزہ آستینوں کو اوپر کیے سینے کا کچھ حصہ ننگا کیے بھیک مانگتی ہے لوگ اُسے غربت کی وجہ سے نہیں بل کہ عریانی کی کشش کی وجہ سے اُسے کچھ نہ کچھ دے جاتے ہیں مصنف نے معاشرے کو دیکھتے ہوئے اس کی عریان پسندی اور بے رہروی کے پہلو کو بھی اُجاگر کیا ہے۔اس کا ذہن کسی ایک نقطے پر مرکوز نہیں ہے کبھی وہ سمندر کی تہہ میں اتر جاتا ہے کبھی آسمانوں میں چلا جاتا ہے پھر اس افسانے میں ڈرامے کا ذکر کیا گیا ہے جس میں معمول میں ہونے والے واقعات دکھائے جاتے ہیں لیکن یہ بھی کوئی نئی بات نہیں ہے اس سے کسی کو کوئی فرق نہیں پہنچتا۔لہٰذا اس نے ان واقعات کو لکھنا بھی ترک کر دیا۔

مصنف یہ سوچتا ہے کہ لکھوں تو کس پر لکھوں معاشرے کی بے رہروی، جھوٹ فریب اور دھوکہ دہی زندگی کا معمول بن چکا ہے اس سے پہلے بھی کئی کہانیاں لکھی جا چکی ہیں جو لائبریریوں کی زینت تو ہیں لیکن لوگوں نے ان سے سبق حاصل نہیں کیا، بات عمل پر ختم ہوتی ہے خیالی پلاؤ پکانے سے نہیں اور موجودہ دور کے حکمرانوں پر بھی کڑی نکتہ چینی کی ہے کہ بجلی کی لوڈ شیڈنگ کا کوئی وقت مقرر نہیں جب جی میں آئے بجلی بند کر دیتے ہیں اور جب جی میں آئے بجلی بحال کر دیتے ہیں جس سے روزمرہ زندگی پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔

یکا یک بجلی کے آنے سے ٹی وی جو آن پڑا تھا اس پر ایک فلم چل پڑی ہے جس میں قتل و غارت اور ظلم و بربریت کے مناظر دکھائی دیے جارہے تھے ہر طرف رونے چیخنے اور چلانے کی آوازیں آرہی تھیں اگر دیکھا جائے تو

اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ فلم کے علاوہ بھی ہمارے معاشرے میں ناانصافی، ظلم وتشدد، دہشت گردی، لاقانونیت کا دور دورہ ہے دوسری طرف مصنف نے حکومت وقت کے خلاف یہ احتجاج کیا ہے کہ حکومت کی طرف سے کوئی معقول انتظام نہیں ہے جگہ جگہ گندگی کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں جو مختلف بیماریوں کا سبب بنتے ہیں اور سردی زیادہ ہو تو غریب لوگوں کی زندگی متاثر ہوتی ہے مصنف نے اپنے گہرے مشاہدے سے اردگرد کے واقعات کو ہمارے سامنے لایا ہے، جو آئے روز ہم دیکھتے ہیں۔

اس افسانے میں سیاسی پہلو بھی اُجاگر کیا ہے جہاں ہر طرف بچے بھوک سے بلک رہے ہیں اور اُن حکمرانوں اور سیاستدانوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی ہمیں سبز باغ دکھا کر ہمارا ہی استعمار کیا جا رہا ہے انصاف کے نام پر ایک ڈھونگ، فریب اور دھوکہ ہے۔ جیسے وہ خود ہی لکھتے ہیں:

> ''مجھے کمزورلوگوں کے مسائل پر لکھنا چاہیے یا پھر طاقتور ممالک کے مظالم کو کھول کھول کر سامنے لانا چاہیے۔ بچے بھوک سے بلک رہے ہیں کچھ تو صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ دِکھ رہے ہیں، غذائی قلت نے سب کو اپنے حصار میں جکڑ رکھا ہے انسانیت کہاں ہے؟ شاید سب پر غنودگی چھائی ہوئی ہے، وہ سہانے خواب دکھا رہے ہیں، جو کبھی انصاف کے نام پر تبدیلی کا کہہ کر، کبھی حقوق دلوانے کی خاطر ہمیں ہانکے پکارے جا رہے ہیں اور ہم اپنا خون پی کر کبھی ایک جگہ جا اُچھلتے ہیں تو کبھی دوسری جگہ جا کودتے ہیں، وہ ہمیں اس حالت میں دیکھ کر محظوظ تو ہوتے ہوں گے۔'' ۳۸

مصنف نے معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں اور سیاسی لیڈروں کی حقیقت ہمارے سامنے لائی ہے۔ کہ الیکشن کے وقت ہمیں سبز باغ دکھلائے جاتے ہیں ہمارے خیر خواہ ہوتے ہیں لیکن جب اپنا مطلب پورا ہو جاتا ہے تو کم ہی نظر آتے ہیں گویا دھوکہ فریب دیا جاتا ہے انسانیت نام کی کوئی شے باقی نہیں رہی مصنف نے حالات وواقعات کی سچی تصویر کشی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

> ''جہاں محسوسات، احساسات اور خیالات کی کوئی قدر نہ ہو، جہاں علمی خزینے ردی کی طرح فٹ پاتھوں پر دھول پھانک رہے ہوں، جہاں لفظوں کے کاریگر پاگل تصور کیے جاتے ہوں، جہاں انسان منڈی کی اشیاء کی طرح مایا کے ترازو میں تولا جائے، جہاں مذہب کے نام پر گردنیں کاٹی جائیں، جہاں انسانی زندگی کی کوئی قدر نہ ہو، جہاں اللہ

کے نام پر دھوکا دیا جاتا ہو، جہاں روٹی کے لیے عصمتیں نیلام ہوتی ہوں، جہاں جھوٹ، منافقت، دروغ گوئی اور چرب زبانی کو سیاست کہا جاتا ہو، جہاں ایک جیسے شہریوں کے لیے قانون میں تفریق ہو، جہاں حق والوں کو خفت اُٹھانی پڑے، جہاں مجرم سرعام دندناتے پھرتے ہوں، جہاں مظلوم پہ ہی ظلم رواں رکھا جائے، جہاں رشتے معیار کی بھینٹ چڑھتے ہوں، جہاں سچ منہ چھپائے اور جھوٹ بغلیں بجائے، کیا وہاں کہانی کا لکھنا ضروری ہے؟''۳۹

آخر میں مصنف کے اس خیال سے ہم پڑھنے والے قطعاً متفق نہیں ہیں کہ لکھنا پڑھنا چھوڑ دیں معاشرے کی برائیاں بتانا چھوڑ دیں حاکمِ وقت کی ناانصافیوں اور چیرہ دستیاں لکھنا بند کر دیں ہر لکھاری کو چاہیے کہ وہ لکھے ،حضرت موسیٰؑ کی تبلیغ کے بارے میں ہر عام و خاص کو آگاہ کرے اور فرعون کے ظلم و تشدد اور خُدائی دعویٰ کرنے والے کے بارے میں بھی عوام الناس کو اپنے قلم سے آگاہ کرتا رہے کسی نے خوب ہی کہا ہے ''قلم تیز چلتا ہے تلوار سے'' اس معاشرے میں ہونے والے سیاسی اور دیگر ایسے واقعات جس سے عوام بہت سی تکلیف اُٹھاتے ہیں مصنف نے بڑی دلیری سے اس حقیقت سے پردہ اُٹھایا ہے۔

افسانہ ''کتمان'' میں ایسے لوگوں کا ذکر کیا ہے جو دکھاوے اور ریاکاری میں مبتلا ہیں اس کہانی میں مصنف اپنے آپ کو یہ ظاہر کرتا ہے کہ بات کرنے سے پہلے ناپ تول لوتا کہ کوئی ایسی بات منہ سے نہ نکل جائے جو سامنے بیٹھے سننے والوں کو ناگوار گزرے اس لیے وہ کسی کے پوچھنے پر پہلے بات کو سوچتا ہے، سمجھتا ہے اور پھر اپنے سننے والوں کو سناتا ہے۔ وہ خیالوں کی دنیا میں ہمیشہ گم رہتا ہے کبھی کبھی جب وہ کسی بات کے بارے میں سوچتا ہے اور دنیا کو دیکھتا ہے تو اس کی طبیعت میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے اور کبھی کبھی جب وہ اس دنیا کے بُرے اعمال کو دیکھتا ہے منفی سوچ کے بارے میں غور کرتا ہے تو پریشانی میں ڈوب جاتا ہے جس سے اس کی طبیعت قدرے ناساز ہو جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ فلسفیوں کی طرح کئی گھنٹے غور و خوض میں ڈوبا رہتا ہے۔

زندگی کا کوئی نصب العین نہیں ہر کوئی بھاگ دوڑ میں لگا ہوا ہے کس کے پیچھے یا کس سے بچ کر اس کا کوئی علم نہیں ہے۔ مصنف کے دل میں پاکیزگی بھی ہے اور پرہیزگاری بھی وہ اپنے سامنے خوبصورت عورتوں کو اور لڑکیوں کو دیکھتا ہے کبھی تو ان کے حسن کی تعریف کرتا ہے پھر یکایک اس کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ انسانوں کی چاہے وہ مرد ہو یا عورت اصل خوبی باطن کی پاکیزگی ہے لہٰذا وہ دل کی پاکیزگی سے زیادہ متاثر ہوتا ہے اور ظاہری خوبصورتی

کونظر انداز کر دیتا ہے مصنف نے اپنے سامنے ایک خوبصورت عورت کواس سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا اس کے خیال میں وہ عورت نہیں بل کہ ایک دنیا ہے جس میں نیکیاں کم اور برائیاں زیادہ ہیں اس وجہ سے برائیوں نے اُسے اپنے حصار میں جکڑ لیا ہے اور دنیا کے اس حسین وجمیل دھوکے میں نہیں آتا۔اس کہانی میں معاشرے میں ایسی برائی بتائی گئی ہے جونفس کی ہے آج کے دور میں یہ غلیظ بُرائی ہر جگہ پھیلی ہوئی ہے جو وقتی طور پر آپ کو لذت دیتی ہے لیکن لذت ختم ہو جانے کے بعد آپ سے گھن آنا شروع ہو جاتی ہے ایک عجیب وغریب کیفیت طاری ہو جاتی ہے اس بُرائی میں اس دنیا کے لوگ ہر وقت زندگی گزارتے ہیں اور خود کو اس غلاظت اور بد بو والی زندگی کو اپنا سب کچھ بنایا ہوا ہے وہ دھوکے کی زندگی گزار رہے ہیں۔

اور ایسے لوگ بھی ہیں جو گفتار کے غازی تو ہیں لیکن کردار کے غازی نہیں ہیں باتوں سے نہیں بل کہ عمل سے زندگی بنتی ہے اور ہم بات تو کر دیتے ہیں لیکن اس پر عمل نہیں کرتے اور ایسی ایسی رائے دیتے ہیں کہ جیسے ظاہری اور باطنی سب کچھ معلوم ہے۔اس افسانے میں ان لوگوں کے بارے میں بتایا ہے جو ایسی باتیں کرتے ہیں۔

> ''لوگ بھی بس جب رائے دینے پہ آئیں تو زمین آسمان کے قلابے ملانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے وہ ظاہر دیکھ رائے دینے میں حق بجانب ہیں۔بھلا وہ باطن میں اتر بھی کب سکتے ہیں ،اِن جاہل لوگوں کی باتوں پر کیونکر اعتبار کروں جن کو حقائق کا کوئی علم نہیں۔''[۴۰]

مصنف کے دل میں نیکی کا بھی بھر پور طریقے سے جذبہ موجود ہے اس لیے وہ نماز پڑھنے کے لیے مسجد کی تلاش میں ہے اور ہمیں یہ بات بتائی گئی ہے سب سے پہلے نماز ہے باقی سب کام بعد میں ہیں۔جب اس نے پہاڑی پر ایک مسجد دیکھی اور نماز ادا کرنے وہاں چلا گیا جب وہ مسجد کے قریب پہنچا تو مسجد کو بند دیکھ کر حیران ہوا جس پر پتھر کا بڑا تالا لگا ہوا ہے وہ مسجد کے بارے میں لکھتا ہے:

> ''اتنا بڑا دروازہ،اس پر خوبصورت نقش نگاری اور قرآنی آیات کی مختلف رنگوں اور رسم الخطوں میں خطاطی اس کی نظروں کو خیرہ کیے جارہی تھی۔مسجد کے دروازے پر بڑا سا قفل پڑا تھا، یہ دیکھ کر مسجد کے اندر نماز پڑھنے کی خواہش دم توڑ گئی۔''[۴۱]

جس کا مطلب ہے دنیا دکھاوے کا کام کرتی ہے مسجدیں موجود ہیں لیکن دلوں پر کفر کے تالے لگے ہوئے ہیں۔اچھی مسجدیں تو تعمیر کروائی جاتی ہیں لیکن کوئی نمازی موجود نہیں ہوتا تو دکھاوے کے لیے مسجدیں کیوں بناتے ہیں؟اس سے بہتر ہے کسی غریب کی مدد کردی جائے۔آج کل بھی مسجدیں ویران ہیں اور لوگ اپنے اپنے کاموں میں ایسے کھوئے ہوئے ہیں کہ اللہ کو بھول گئے ہیں اللہ اکبر کی صدا کانوں پر پڑتی ہے لیکن کوئی اسے سن کر نماز ادا کرنے نہیں جاتے،آخرت کو بھول چکے ہیں مصنف نے کچھ یوں لکھا ہے:

''جب مسجدیں بے رونق اور مدرسے ویران ہو جائیں تو سمجھ لیں کہ عوام دنیا داری کی اعلیٰ سطح پر جا پہنچی ہے۔''۴۲

مصنف نے ایک ایسی عورت کو بھی پیش کیا ہے جس کو اس کے شوہر نے ظالم معاشرے میں اکیلا چھوڑ دیا تھا۔اوراس نے معاشرے کی بے رہروی اور گناہوں کی زندگی کے بارے میں بھی اشارہ کیا ہے۔عورت نے اپنے بچوں کا پیٹ بھرنے کے لیے جسم فروشی کا کام شروع کر لیا اوراس درندہ صفت معاشرے نے اس عورت کو مجبوراً ایسے کام میں مبتلا کیا۔آگے جا کر مصنف نے شفاف پانی کا ذکر کیا ہے جس سے مراد نیکیوں کی دنیا ہے جب دنیا نے ترقی نہیں کی تھی لوگ اس وقت اپنے ایمان اور قول کے پکے تھے اب اس دنیا میں بے ایمانی،دھونس،حق تلفی،جھوٹ کا دور دورا ہے یہی وجہ ہے ہماری ظاہری جسموں کی غلاظت سے دریا،ندی،سمندر گندے ہو چکے ہیں۔یہ سب دیکھنے کے بعد کہ دنیا دُکھوں کا گھر ہے پاک صاف پانی بھی ہماری اندرونی اور بیرونی غلاظتوں سے اور مردہ جانوروں سے ناپاک ہو چکا ہے۔اس پانی کا ذکر مصنف نے یوں کیا ہے جو لوگ اپنے جسموں کو بہت سی برائیوں سے بھر دیتے ہیں۔

''جو لوگ اپنے شفاف جسموں کو سیال گندے مادوں سے بھر دیتے ہیں ان کے جسموں کی اندر کی غلاظت،باہر کی گندگی،پیپ اور پھوڑے یہاں دھوئے جاتے ہیں،وہ میل اور جسم کی کثافت مردار جانوروں کی صورت اختیار کر جاتی ہے یہ پانی ان کی غلاظتوں کو دھو کر پھر سے صاف،شفاف بنا دیتا ہے کبھی یہ پانی بھی شفافیت میں اپنی مثال آپ تھا اب اس میں غلاظتیں در آئی ہیں آلودگی سے اصلیت کھو چکا،تبھی تعفن کا سبب بن رہا ہے۔''۴۳

لیکن آخر میں مصنف نے اپنی کہانی کو ایک رُخ دے کر یعنی خوبصورت عورت ،لڑکیاں قطار در قطار صاف پانی کے لیے چشمہ پر موجود ہیں اور یہ امید کی جا سکتی ہے کہ دنیا میں پھر انصاف ،خدا ترسی ،رحم دلی ، بھائی چارہ ،اخوت اور ہمدردی کا دور دورا ہوگا۔ بقول علامہ اقبالؒ:

''نہیں ہے نا امید اقبالؔ اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت ذرخیز ہے ساقی''۴۴؎

افسانہ ''وی'' کا مطلب Victory جو ہاتھ کی انگلیوں سے بنایا جاتا ہے اِس افسانے میں دور حاضر کی گندی سیاست ،موقع پرست دوستوں اور اپنا مطلب نکالنے والوں کا بخوبی تجزیہ کیا گیا ہے کہ میں اپنے دوستوں کی باتوں پر عمل کر کے زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا ہوں ،خدارا میرے بعد اس گندی سیاست میں غلط وعدوں پر اور خودغرض لوگوں پر ہرگز اعتبار نہ کیا جائے ۔سیاست میں کوئی وعدہ ،کوئی ہمدردی ،کوئی بھائی چارہ نہیں ہوتا سب کو اپنا اپنا مفاد پسند ہوتا ہے۔ ہر کوئی سیاست میں اس لیے آنا چاہتا ہے کہ اس کی شہرت بنے ،وہ ملک کا بیڑا غرق کر جاتے ہیں اپنا مفاد حاصل کرتے ہیں اور ساتھ ہی دوسرے گھرانے کے نوجوانوں کا استعمال کر کے ان کی زندگی تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ ہر کوئی ایک دوسرے کو کچا کھا جانے کی نوبت تک آ پہنچا ہے۔ کچھ وہی لوگ آپس میں جڑے ہیں جنہیں اپنا کچھ نہ کچھ مفاد نظر آتا ہے سیاست میں ایک عجیب وغریب سی صورتحال بنی ہوئی ہے اس کی تصویر مصنف نے ایسی کھینچی ہے:

''حالات اس قدر بدل چکے تھے کہ اب ہر کوئی خود کو غیر محفوظ سمجھنے لگا تھا۔ مختلف شہروں میں پے در پے دھماکوں نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پڑوسی ممالک بھی اپنے مفاد کی تکمیل کی خاطر ملکی حالات پر اثرات مرتب کر رہے تھے ۔ایک جانب کی محفوظ سرحد بھی غیر محفوظ ہو چکی تھی ۔کئی اپنے ،دشمن ممالک کے ہاتھوں میں کھلونوں کا کام بھی سرانجام دے رہے تھے ۔مسالک جو اپنے اندر ہی اندر ایک دوسرے کو کاٹے جا رہے تھے اب کھل کر سامنے لڑ رہے تھے کوئی کسی کی بات ماننے کو تیار نہ تھا۔''۴۵؎

یک طرف ملک کی یہ صورتحال ہے تو دوسری طرف سیاسی پارٹیاں ایک دوسرے کے ساتھ لڑ رہی ہیں صرف اپنے مفاد کی خاطر ،انہیں ملک سے اور عوام سے کوئی سروکار نہیں ہے اور مذہبی قائدین بھی اسی طرح کر رہے ہیں اسلام

کے نام پر جھوٹ اور فساد پھیلاتے ہیں۔لوگ بہت سے مسالک میں تقسیم ہو گئے ہیں اور ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کے درپے ہیں آئے دن یہی ملکی صورتحال رہتی ہے کسی کو کسی کی کوئی پرواہ نہیں ملک سے امن چین ختم ہو چکا ہے مذہبی سیاست کو مصنف نے یوں بیان کیا ہے:

''جس ملک کی سیاسی قیادت جھوٹ اور مذہبی رہنما فریب پر اُتر آئیں، وہاں کونسا امن اور کیسی سلامتی۔''۴۶

آج کل سیاست میں اپنے مطلب کے لیے جو کچھ ہو رہا ہے اس کی ایک جھلک افسانہ ''وی'' میں دیکھی جا سکتی ہے کہ کیسے ایک ہونہار اور نوجوان لڑکے یاسر صدیقی کو سیاست کی دلدل میں پھنسایا جاتا ہے۔ جو اپنے گھر کا واحد کفیل ہے جو والد کے روکنے کے باوجود اپنی کالج کی زندگی سے سیاست میں چلا جاتا ہے جب سیاسی پارٹی نے اسے دیکھا، پرکھا اور محسوس کیا یہ لڑکا ان کے کام آئے گا اس کو منہ مانگے پیسے، اچھی اچھی جگہوں پر سیر کروانا، مہنگے ترین ہوٹلز میں کھانا کھلانا اور بے رہرو لڑکیوں سے تعارف کرانا اور یہی سبز باغ دکھا کر سیاست میں اپنا مقصد نکالنے کے لیے یاسر صدیقی کو آلہ کار بنایا۔ وہ ان دوستوں سے بہت آگے نکل چکا تھا جو ابھی بھی سڑکوں پر نوکری کی تلاش میں پھر رہے تھے اور یہ ہمارے ملک کا بڑا المیہ ہے کہ حق دار کو اس کا حق نہیں ملتا۔ یاسر صدیقی اپنی پارٹی میں اہم مقام پر فائز تھا اس کا بھرپور استقبال ہوتا اور ہر جلسے میں سرِ فہرست ہوتا اسے وہ دن یاد آئے جب وہ نیا نیا سیاست میں گیا تھا اور اس کے والد نے اس سے یہ کہا تھا:

''بیٹا تمھاری منزل یہ نہیں، تو کن راستوں پر چل نکلا ہے۔ یہ لوگ صرف اپنے قائدے کے لیے استعمال کرنا جانتے ہیں تو پڑھ اور ان کاموں سے دور رہ۔''۴۷

لیکن اس نے اپنے والد کی نصیحت کو ایک کان سے سنا اور دوسرے کان سے نکال دیا۔ بڑوں کی نصیحت پر ہمیشہ عمل کرنا چاہیے کیوں کہ ان کے سامنے بہت سے ایسے واقعات رونما ہو چکے ہوتے ہیں جن سے وہ آگاہ کرتے ہیں۔ یاسر صدیقی کو اس کے لیڈروں نے مخالف سیاسی پارٹی کے ساتھ فساد کروایا جس کے نتیجے میں اس سے مخالف پارٹی کا ایک کارکن قتل کروا دیا اور یہ سب سیاسی لیڈروں نے اپنے ذاتی مفاد کے لیے کیا تھا جس کی پاداش میں اُسے نچلی عدالت نے سزائے موت سنائی اور پھر اعلیٰ عدالت نے بھی اس کی اپیل کو خارج کر دیا اب تو اس کے سامنے کال

کوٹھڑی اور پھندے کے سوا کچھ نہ تھا وہ سیاسی لیڈر جس کے لیے یہ سب کچھ کیا تھا وہ اسے بھول چکا تھا، اسے یہ یقین تھا کہ وہ میری مدد کرے گا لیکن ایسا ہرگز نہ ہوا۔ جب اس کے سامنے اخبار لایا گیا جس میں اس کی موت کی خبر نشر تھی اور ساتھ ہی اس کی نظر ایک تصویر پر جا ٹکی، جس میں اس کا لیڈر مخالف لیڈر کے ساتھ کھڑا ہے۔ اس سیاسی عہدے دار کی تصویر یوں پیش کی گئی ہے:

> ''پارٹی کے جس اعلیٰ عہدے دار نے اُسے مخالف امیدوار کو قتل کرنے پر اُکسایا تھا ''وی'' کا نشان بنائے مخالف پارٹی کے عہدے دار کی کمر میں ہاتھ ڈالے مُسکرا رہا تھا۔''۴۸؎

یاسر صدیقی کا سزائے موت سے دل تو کافی پہلے پریشان تھا لیکن اپنے ہمدرد، غم خوار کو دوسری پارٹی کے سربراہ کے ساتھ خوشی سے میل جول رکھنا اُسے یہ دیکھ کر بہت دُکھ ہوا موت کے منہ میں جاتے جاتے اُسے وہ نصیحت بھی یاد آنے لگی جو برسوں پہلے اس کے والد نے کہی تھی۔ اگر وہ سمجھ لیتا تو وہ گندی سیاست میں آنے کا نام تک نہ لیتا اُس کی موت نے سب کو مضطرب کر رکھا تھا وہ لڑکی بھی اس کے انتظار میں تھی جس کے ساتھ اس نے زندگی گزارنے کا وعدہ کیا تھا لیکن اب جو کچھ ہونا تھا ہو چکا اور یہ محاورہ اس پر بالکل صادق آتا ہے:

''اب پچھتائے کیا حوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت''

اس افسانے میں ہمارے ملک اور اس کے سیاسی عہدے داروں کی حقیقت ہمارے سامنے لائی ہے کہ کس طرح وہ اپنے مفاد کے لیے دوسروں کو استعمال کرتے ہیں انہیں عوام کا کوئی خیال نہیں ہوتا اور نہ ہی ان کا، جو، ان سے نبھا کرتے کرتے اپنے گھر بار کو داؤ پر لگا دیتے ہیں صرف ان کی خاطر، لیکن یہ بے حس صرف اپنا مطلب چاہتے ہیں انہیں دوسرے کسی کی پریشانی نظر نہیں آتی ہر وقت جھوٹ بولتے اور فریب دیتے ہیں اور جھوٹے امن کے نعرے لگاتے ہیں۔ کہتے کچھ اور کرتے کچھ ہیں۔

افسانہ ''درد مشترک'' میں مصنف نے میاں بیوی کے رشتے کو سامنے لایا ہے اور یہی وہ رشتہ ہوتا ہے جس میں مرد عورت کا اور عورت مرد کا بے حد خیال رکھتی ہے اور ایک دوسرے کے ساتھ پیار، محبت، اُلفت اور باہمی اشتراک کی زندگی گزارنے کے بارے میں بھرپور ذکر کیا ہے۔ نا جانے کچھ ماہ و سال ازدواجی زندگی بسر کرنے کے بعد وہ بیوی جو اپنے خاوند سے بے پناہ اور لامتناہی محبت کرتی تھی اس سے یکا یک جدا ہو کر موت کے منہ میں چلی گئی اب اس کی پیار بھری باتیں اس کے خیالوں میں آتی ہیں جس میں وہ کہتی تھی:

''سنیئے آپ اکثر کھانا دیر سے کھاتے ہیں بار بار گرم کرنا پڑتا ہے، آپ کھانا وقت پر کھالیا کریں ۔ میں نے آپ کے لیے نئی واسکٹ کا درزی کو کہہ دیا تھا آج صبح وہ دے گا، پہنیئے گا، سچی آپ پر بہت جچتی ہے ۔ ڈاکٹروں نے جو دوائی تجویز کی وقت پہ لیجیے گا ۔ آپ کو سردی ایک دم پکڑ لیتی ہے ۔''۴۹

آ گے چل کر مصنف نے قبر کا ذکر کیا ہے کہ کوئی بھی انسان چاہے اچھا ہو یا بُرا اُسے مرنا ہے اور قبر میں جانا ہے بہت سے ایسے لوگ ہیں جن کے پیارے ان کو چھوڑ کر جا چکے ہیں اور پیچھے اپنی یاد چھوڑ گئے ہیں اور انہی یادوں میں وہ زندگی گزار دیتے ہیں ۔ قبر اور اپنے پیاروں کے بچھڑنے کے بارے میں مصنف نے لکھا ہے:

''قبر پر پڑے پھولوں کی مقدار اور معیار کچھ بھی ہو، پیاروں کی یادوں اور یادوں سے وابستہ باتوں پر بہنے والے آنسوؤں میں چھپا کرب اور جسم میں سرائیت کی ہوئی بے چینی سب کی ایک جیسے ہوتی ہے ۔''۵۰

قبر کے بارے میں مزید لکھتے ہیں کہ بظاہر تو ہمیں مٹی نظر آتی ہے لیکن اس کے اندر کی اپنائیت، اپنا کوئی قریبی ہوتا ہے جس سے لگاؤ ہوتا ہے اور اس کی قبر کو چھو کر ہی دل کو سکون دیا جا سکتا ہے:

''قبر مٹی کا بظاہر ڈھیر اپنے اندر کس قدر اپنائیت سمیٹے ہوتی ہے اس مٹی کو چھو کر جو قلبی اطمینان وجود کو میسر آتا ہے وہ اس سے دور کبھی بھی نہیں مل سکتا ۔''۵۱

اس افسانے میں قبرستان کا بھی ذکر کیا ہے اور مختلف کچی پکی قبروں پر جا کر دعا اور حیرانگی کا اظہار کیا ہے کہ ایسے ہستے بستے لوگ جنھوں نے زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں کارگردگی دکھائی ہے انسانوں کے ساتھ ہمدردی، محبت اور بھائی چارے سے پیش آتے رہے ہیں نہ جانے آج وہ منوں مٹی کے نیچے خاک کی ڈھیری تلے ہم سے کیوں پوشیدہ ہیں لیکن کل ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوگا لوگ موت سے گھبراتے ہیں اور بھاگتے بھی ہیں لیکن موت ایک ایسی اٹل حقیقت ہے کہ وقت مقررہ پر آنے سے اُسے کوئی نہیں روک سکتا ہر انسان نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے مصنف کہتا ہے قبر پر جانا دعائیں مانگنا عبرت حاصل کرنا اور اس دنیا سے دل نہ لگانا کیوں کہ آخری ٹھکانا قبرستان ہی ہے ۔ اور جو لوگ اس دنیا سے چلے گئے ہیں اپنے بہت ہی قریبی رشتہ دار والدین، بزرگ یا جو بھی جن سے بہت محبت ہوتی ہے ان کی یاد ہی

پھر سب کچھ ہوتی ہے اور یادوں کا ایک اٹوٹ انگ ہوتا ہے جو کبھی بھولے سے نہیں بھولتا۔اپنوں کے چلے جانے کا غم سب کا ایک جیسا ہوتا ہے کوئی آنسو بہاتا ہے کوئی دل ہی دل میں اس کو یاد کرتا ہے جو یادگار لمحات اس کے ساتھ گزارے تھے۔

لیکن مایوس ہونا اللہ کو پسند نہیں ہے ایک نہ ایک دن سب کو اس دنیا سے جانا ہے موت سب کو آنی ہے لہٰذا ایسی زندگی گزاریں جو باقی رہنے والوں کے لیے اچھی یاد بنے اور اسی فکر کو ذہن میں رکھتے ہوئے مصنف نے میاں بیوی کے نہ جدا ہونے والے پیار اور الگ نہ ہونے والے جسم کو ہمارے سامنے رکھا ہے کہ دنیا فانی ہے کسی کے ساتھ غلط سلوک، دھوکا، فریب نہ کریں لیکن دیکھا جائے تو آج کل ایسا ہی ہو رہا ہے لوگ موت کو بھول چکے ہیں اور اس زندگی کو اصل زندگی سمجھ لیا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

افسانہ ''خلش'' معاشرے میں ایسے لوگوں کی کہانی بیان کرتا ہے جو بہت سے مسائل سے دو چار ہیں دکھ تکلیف ان کا پیچھا نہیں چھوڑتی اور اس قدر ذہنی الجھن اور وہم کا شکار ہو جاتے ہیں خود کو ان تمام امتحانوں سے نجات میں ہی بہتری سمجھتے ہیں، اس افسانے میں مصنف عجیب وغریب ذہنی انتشار، الجھن اور بے بسی کا شکار ہے وہ سوچتا رہتا کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی طبیعت، عقل اور اس کی فہم وفراست کے بالکل خلاف ہے وہ اپنے اردگرد ہونے والے واقعات کو دیکھتا ہے تو اُسے اس ماحول سے اُلجھن ہونے لگی ہے نہ اسے روشنی اچھی لگتی ہے نہ اُسے گھر کے افراد اچھے لگتے ہیں اگر وہ سوچتا ہے تو سوچتا ہی رہتا ہے رات بھر اُسے نیند نہیں آتی اور نہ ہی اُسے بھوک لگتی ہے اور نہ ہی وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آتا ہے گھر والے سبھی اُسے پاگل سمجھ کر ایک کمرے میں بند کر دیتے ہیں لیکن یہ اس کا علاج نہیں ہے۔وہ پاگل نہیں ہے بل کہ مسائل، آلام کی وجہ سے اس کی یہ کیفیت ہوئی ہے۔

اس افسانے میں عظمت علی کی کہانی بیان کی ہے جو اُلجھن اور مسائل کا شکار ہے وہ سو سکتا ہے اور نہ ہی کوئی اور زندگی کے باقی کام کر سکتا ہے ایک عجیب سا وہم اس میں سرایت کر چکا ہوتا ہے جب اس کے بڑے بھائی کی شادی ہو گئی اللہ نے اُسے اولاد سے بھی نوازہ اس کے والد بھی ملازمت سے ریٹائرڈ ہو چکے تھے اس کے والد اور والدہ اپنے پوتے، پوتیوں کے ساتھ پیار کرتے تھے اور اپنی زندگی خوشی خوشی بسر کر رہے تھے لیکن وہ ایک عجیب الجھن کا شکار تھا اور یہی سوچتا رہتا کہ گھر میں رہنے سہنے کے لیے جگہ کم پڑ چکی ہے ان کے والد بزرگوار پوتے پوتیوں میں وقت گزارتے ہیں گھر کا کوئی فرد بھی میٹھی میٹھی باتیں کرنے کا موقع نہیں دیتا ایسا محسوس کرتا کہ اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا اس وجہ سے وہ ہر وقت پریشان اور عجیب اُلجھن کا شکار رہتا اور ایک عجیب سے ذہنی انتشار اور وہم میں مبتلا رہتا اور اسی وہم کی وجہ سے اس نے گھر کے تمام افراد کے کھانے میں زہر ملا دیا اور انہیں صفا ہستی سے مٹا دیا یہ سب اس نے اپنی آئندہ خوشحال

زندگی بسر کرنے کے لیے کیا وہ شادی کرے گا ساری جائیداد کا واحد مالک ہوگا دونوں میاں بیوی عیش کی زندگی بسر کریں گے۔

وہ سارے خاندان کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد خود بھی نیم پاگل ہوگیا تھا اُسے یہ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ اب کیا کرے، کدھر جائے اس نے اپنا علاج ڈاکٹروں، حکیموں سے کرایا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا پھر اس نے پیروں فقیروں کا رُخ کیا اُس کی طبیعت میں کوئی فرق نہیں ہوا۔تعویذ اور دم درود بھی کروائے وہاں سے بھی ناامیدی ہوئی۔نہ ڈاکٹروں، سناسیوں اور نہ ہی مولوی کے تعویذوں سے اسے کوئی فائدہ ہوا۔اُسے اپنا گزرا ہوا دوستوں کے ساتھ سنہرہ زمانہ بار بار یاد آتا تھا جو مزید اس کی حالت کو بگاڑ رہا تھا۔وہ اندرونی طور پر ٹوٹ کا شکار تھا اور ذہنی روحانی طور پر بالکل مفلوج ہو چکا تھا اِن دکھوں، غموں، بیماریوں اور پریشانیوں سے تنگ آ کر خودکشی کر لی۔

آگے چل کر مصنف نے ایک ایسے منظر کو سامنے لایا کہ بھائی بھائی سے لڑتا ہے اور موت کے گھاٹ اُتار دیتا ہے صرف پیسوں کی خاطر، اگر غور کیا جائے تو آج کل بھی ایسا ہی ہو رہا ہے جائیداد، کاروبار کے لیے بھائی بھائی سے جھگڑتا ہے ایک عجیب سا ماحول بنا ہوا ہے اس افسانے میں عباس جو پہلے ہمیشہ ہنس مکھ رہتا تھا۔لیکن اپنے بھائی کے ساتھ لڑ جھگڑ کر دلبرداشتہ ہو کر ایک ہوٹل میں بیٹھا ہوا ہے اس کے دوست صدیقی نے اُسے سمجھایا کہ اپنے بھائی کے ساتھ جھگڑا کرنا یا جھگڑے کو طول دینا اچھی بات نہیں۔ایسے لین دین کا مسئلہ دنیا میں ہوتا رہتا ہے یہ زیادہ پریشانی اور اُلجھن کا مسئلہ نہیں ہے یہ دنیا ہے جس کا مطلب دکھوں کا گھر ہے اس دُکھوں والی دنیا میں خوشی اور غمی کے حالات کا ہونا یا پیدا ہونا کوئی عجیب اور حیرانگی کی بات نہیں ہے۔

دنیا دُکھوں کا گھر ہے اس میں غموں کے بغیر نہ کوئی امیر ہے اور نہ کوئی غریب، چھوٹا نہ بڑا، نہ ادنی ہے نہ اعلیٰ اس سے محفوظ ہے اس دنیا میں جتنا سر بڑا اتنا ہی اسکا درد بڑا۔امیر لوگوں کو ہم دیکھتے ہیں تو خیال کرتے ہیں کہ یہ بڑے سُکھی ہیں لیکن اگر ہم قریب سے دیکھیں تو کوئی بھی سکھی نہیں کسی کی اولاد نہیں اور کسی کو والدین نہ ہونے کا دُکھ ہے جن کے پاس اولادیں ہیں وہ غربت کا شکار ہیں دو وقت کی روٹی کے محتاج ہیں، بیماریوں میں گھیرے ہوئے ہیں غلط قسم کے مقدموں میں پھنسے ہوئے ہیں۔یعنی نہ شہری سُکھی ہیں اور نہ دیہاتی سُکھی ہیں، نہ پڑھے لکھے اور نہ ہی ان پڑھ سُکھی ہیں کیوں کہ معاشرہ عجیب سے مسائل کا شکار ہے ہر کوئی دھوکا دے کر اپنا اُلو سیدھا کرتا ہے کسی دوسرے کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔حکمران وہ بھی دو ہاتھوں سے ملک کو لوٹنے کے چکر میں ہیں حکومت کے اعلیٰ عہدے دار جن میں نچلے طبقے کے ساتھ ساتھ وزرا بھی لوٹ کھسوٹ، دغابازی، ناانصافی پر کمر باندھے ہوئے ہیں۔صدیقی، عباس کو سمجھاتے ہوئے کہتا ہے:

''ہر ایک کسی نہ کسی مسئلہ سے دوچار ہے، بس مسئلے کی نوعیت الگ الگ ہے۔ جس کے پاس جائیداد ہے، بڑا گھر ہے، اس کی اولاد نہیں۔ جن کی اولاد ہے اُن کے پاس اُنہیں رکھنے کے لیے جگہ نہیں ۔ جہاں پیسے کی ریل پیل ہے ، وہاں اتفاق کا فقدان ہے۔ جہاں اتفاق ہے وہاں بھوک اور ننگ نے منہ کھول رکھا ہے۔ جہاں بھوک ننگ نہیں، وہاں بیماریوں نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ جن کے پاس ہم سب کچھ سمجھ رہے ہیں وہ بھی کسی نہ کسی روحانی ،جسمانی ،ذہنی بیماری میں مبتلا ہیں۔ جہاں بیماریاں نہیں وہاں خاندانی جھگڑے منہ کھولے بیٹھے ہیں۔ جہاں جھگڑے نہیں، وہاں کوئی نہ کوئی اور مسئلہ ہوگا۔ میرے دوست! جس کو بھی کریدو گے تمہیں کوئی نہ کوئی کمی ،کوئی نہ کوئی غم ،کوئی نہ کوئی مسئلہ ضرور ملے گا۔''۵۲؎

صدیقی اپنے دوست کو مزید سمجھاتے ہوئے کہتا ہے تا کہ اُسے کچھ حوصلہ ملے اور کسی پریشانی میں خود کو مبتلا نہ کرے اور نہ ہی ایسا کام کرے جو اسلام میں ممنوع ہے یعنی خودکشی:

''ہم بے سمت، بے مقصد اور بے ہنگم دوڑ لگائے ہوئے ہیں۔ دوسروں کا حق مارنے میں مگن ہیں، مگر وہ ذات جس کو رب کریم کہتے ہیں، وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے اُس کے فیصلے اعلیٰ ہوتے ہیں ہمیں اُس کے فیصلوں پر صابر رہنا چاہیے۔ وہ جو کرتا ہے وہی بہتر ہوتا ہے۔''۵۳؎

عباس کو اس کے سگے بھائی نے کاروباری سلسلے میں دھوکا دیا شراکت کے کاروبار میں اُسے بے دخل کر دیا، جس کی وجہ سے وہ در بدر ٹھوکریں کھانے لگا بھائی نے بھائی کا خون پیا اب کہاں کی ہمدردی رہ جاتی ہے۔
مصنف نے معاشرے کی اس کہانی میں بدانتظامی کا بھی ذکر کیا ہے۔ سدرہ کے والدین ایک بم بلاسٹ حادثے میں جان سے گئے اب یہ بڑی سوچنے کی بات ہے کہ بمبار سدرہ کے دشمن نہ دوست ہیں۔ خودکش حملے کرنے والوں کی زندگی کا پس منظر کچھ بھی ہو لیکن موجودہ حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ہر شہری کی جان و مال کی حفاظت کی ضامن ہے۔ اسی طرح اور معاشرے میں موجود ایک بڑی قباحت کی نشاندہی کی گئی ہے یعنی بے جوڑ اور کم عمری کی شادی، جس کا رواج آج کل عام ہے اور یہی معاملہ سدرہ کے ساتھ بھی ہوا۔ بے جوڑ کی شادی اس لیے کرادی گئی کہ اس کے والدین کی جائیداد کو اس سے چھین کر اپنی مرضی کے مطابق ناجائز فائدہ اُٹھایا جائے۔ اس کی شادی اس کی عمر

سے بڑے شخص سے کروادی گئی کیوں کہ سدرہ کا خاوند ملک نواز ایک امیر آدمی تھا اور اس سے پہلے دو بیویوں کو طلاق بھی دے چکا تھا۔ان حالات میں وہ بڑی مایوس ہے کم عمری کی شادی کی وجہ سے اس کا مزید اولاد پیدا کرنا بھی مشکل ہو گیا جو پہلے اولاد پیدا ہونی تھی وہ بھی موت کے منہ میں چلی گئی۔جس کی وجہ سے وہ بیمار رہنے لگی اور کمزوری کی وجہ سے چکر آنے لگتے اس کا کوئی سہارا نہ تھا نہ جانے کی جگہ نہ رہنے کی جگہ تھی۔ایک اپنے والدین کی لاڈلی بچی،خوبصورت آنکھوں اور لمبے بالوں والی ایک زندہ لاش بن چکی تھی ایک قیامت اس پر بپا تھی۔صرف ایک سہیلی شبنم کو کبھی کبھار اس کو ملنے جاتی تھی لیکن اس کے جاتے ہی وہی رونا دھونا اِن دُکھوں پریشانیوں میں وہ ہر وقت ہوتی اس کے سفاک خاوند نے اُسے زہر دے کر ہمیشہ کے لیے سُلا دیا یہ وہ تلخ حقیقت ہے جو ہمارے معاشرے میں لوگ دیکھ سکتے ہیں لیکن اس کے خلاف آواز بلند نہیں کرتے اس بارے میں سنجیدگی سے سوچنا ہوگا۔مگر اس مسلے کو اُجاگر کرنے سے کسی قسم کا حل ہرگز نہیں نکل سکتا۔

> ''ہمیں سوچوں کو بدلنا ہوگا لوگوں کو اپنے ساتھ ملانا ہوگا،انھیں بتانا ہوگا کہ اُن کا فائدہ اور آنے والی نسل کا مستقبل کس طرح محفوظ کیا جا سکتا ہے۔مگر لوگ کب سنیں گے،ان کے اپنے بہت سے بکھیڑے ہیں۔وہ بھی کہاں کہاں قربانی دیں،اُن سے جب بھی قربانی مانگی گئی انھوں نے پیٹھ نہیں دکھائی۔''۵۴؎

اِن دکھ بھری کہانیوں کی طرح عمر گل کی کہانی بھی بڑی دردناک ہے،جس دکان پر وہ ملازم تھا۔مالک نے بے دردی سے نکال دیا وہ ایک ریڑھی پر سودا بیچ کر گزارا کرتا تھا۔اس پر جب یہ مشکل وقت آیا کسی نے اس کی مدد نہیں کی وہ سب کے پاس جاتا لیکن ہر جگہ سے نا امید واپس لوٹتا اس دُکھ کو صرف وہی سمجھ سکتا ہے جس نے سہا ہو۔اخراجات زیادہ ہونے کی وجہ سے نہ وہ مکان کا کرایہ دے سکتا تھا اور نہ ہی اپنی بچیوں کی چھوٹی چھوٹی فرمائشیں پوری کر سکتا۔جب بھی وہ تھکا ٹوٹا گھر آتا تو اس کی بچیاں کاپیاں پنسل مانگتیں تو وہ اُنہیں ٹال دیتا گھر کے اخراجات بہت تھے فاقہ کشی پر نوبت آ گئی کوئی بھی اس کی ان حالات میں مدد کرنے کو تیار نہ تھا مالک مکان نے بھی کرایہ نہ دینے پر مکان خالی کرنے کی دھمکی دے دی وہ بھی غم اُسے کھائے جا رہا تھا اور بے چینی نے اس کے دل و دماغ میں گھر کر لیا تھا۔پانچ ہزار میں جو ریڑھی خریدی تھی وہ بمشکل پانچ سو میں فروخت ہوئی اور کھانے پینے کا بندوبست کیا۔اس نے تمام تکالیف،دکھوں کے باوجود ہمت نہیں ہاری،اللہ پر توکل اور بھروسہ رکھا اور صبر کیے رکھا اپنی محنت مزدوری کی اپنی ایک بیٹی کو نرس بنایا اور دوسری بیٹی کو معلّمہ بنایا۔لیکن ان کے پڑوس میں ہی ایک دل ہلا دینے والا واقعہ پیش آیا کہ غربت نے کئی آدمیوں کی

جان لی ہے۔روٹی، کپڑااورمکان کی قلت کی وجہ سے ایک آدمی نے اپنی بیوی اور دو معصوم بچوں کوموت کے گھاٹ اتار کر خود پھانسی کے تختے پر چڑھ گیا اس طرح کے واقعات ہمارے معاشرے میں پائے جاتے ہیں غربت کی وجہ سے لوگ اس طرح کا قدم اٹھانے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور یہ حکومت کے لیے مر مٹنے کا مقام ہے۔ان محرومیوں کا مصنف یہ حل پیش کرتا ہے۔

''ہمیں معاشیات ٹھیک کرنی ہوں گی،غربت زدہ معاشرہ اور بھوک سے سسکتے مرتے لوگ کوئی بھی تبدیلی نہیں لا سکتے۔تبدیلی کا وہی سوچیں گے جن کے پیٹ بھرے ہوں گے۔جن کے گھر کے اخراجات اُنھیں باؤلا نہیں کریں۔غریب کو تو کوئی قرض بھی نہیں دیتا۔''۵۵

آخر میں مصنف ان دکھ بھرے واقعات سے تنگ آ کر بغاوت پر اتر آیا ہے اس نے وقت حکومت پر تنقید کی ،مذہبی ٹھیکیداروں کو بھی نشانہ بنایا۔یہ لوگ چندہ تو جمع کرتے ہیں اور جس کے نام پر جمع کرتے ہیں وہ لوگوں تک نہیں پہنچتا خود ہی ہڑپ لیتے ہیں۔فلاح و بہبود کی جتنی بھی تنظیمیں ہیں کسی کو کسی کا خیال نہیں۔ہمدردی نہیں بس اپنی اپنی جیبیں بھرنے کے لیے مختلف ہتھکنڈے ہمدردی کے نام پر اور مذہب کے نام پر کرتے ہیں سب کے سب بے ایمان، بے درد، لالچی خود غرض اور اپنے اپنے مفاد کے غلام ہیں کسی کو کسی کی پرواہ نہیں پورا جہاں مر جائے انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا یہی وجہ ہے کہ مصنف ان خیالات وواقعات کو دیکھ کر اتنا پریشان ہو جاتا ہے کہ منہ سے جو بات آئے کہہ دیتا ہے کسی کی پرواہ نہیں کرتا کیوں کہ اس کا ذہن ان خیالات کو دیکھ کر ماؤف ہو چکا ہے اور اس کی عقل کا آدھا پن بغاوت ،غصہ اور گالی گلوچ کے سوا کچھ نہیں اور اسے خود بھی معلوم نہیں کہ وہ بے خودی میں کیا کہہ رہا ہے اور کس سے کہہ رہا ہے۔

افسانہ''غلاظت''میں ہونے والی بہت سی بُرائیوں کو اُجاگر کیا ہے۔جس میں بے روزگاری کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہاں ہر کوئی دھوکا دیتا ہے یہاں معاشرے میں کوئی آدمی بھی ظاہر اور باطن کے لحاظ سے ایک نہیں ہے لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے، دھوکا دینے کے لیے اور اپنا مطلب نکالنے کے لیے چہرے پر کئی چہرے سجا رکھے ہیں۔وہ خود ہی کہتا ہے:

''یہاں کون ہے جس نے چہرہ پہ چہرہ نہیں سجا رکھا۔کئی تو تین تین، چار چار چہروں کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں اور معاشرے میں ان کا ایک مقام بھی نہیں۔'' ۵۶؎

مصنف اس دنیا کے فرسودہ طور طریقوں سے نالاں ہے اور اس سے بڑھ کر دنیا کے رہنے والوں کی بے حسی، بے ایمانی اور جھوٹ سے اور زیادہ دن رات پریشان رہتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ وہ ایسے ہی گندے معاشرے میں رہ کر خود بھی گندا ہو جائے گا۔اور یہی سوچتا ہے کہ دنیا میں آسودگی کیسے حاصل کی جائے جب کہ اُس کے چاروں طرف دُکھوں، پریشانیوں اور مصیبتوں کا جال بچھا ہوا ہے وہ اپنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے اور بڑبڑاتے ہوئے پورا پورا دن اور پوری پوری رات اِسی خیال میں بغیر نیند کے اور آرام و سکون کے گزار دیتا ہے۔وہ خود ہی کہتا ہے:

''جس طرح کی آسودگی میں چاہتا ہوں وہ مجھے میسر نہیں اور جو مجھے میسر ہے اُس میں آسودگی نہیں۔آسودگی کے پیچھے بھاگتے بھاگتے ایک دن میں بھی آسودگانِ خاک میں مل جاؤں گا۔'' ۵۷؎

آگے چل کر وہ مزید یہ کہتا ہے کہ:

''یہ اُلجھن جو مجھے بے چین کیے ہوئے ہے اور میری دسترس میں بھی نہیں۔نجانے کب تک میرے اعصاب پر سائے کی مانند سوار رہے گی،ہمیں انسانی تقاضوں کو کھلے دِل سے تسلیم کر لینا چاہیے،تنہائی اور افسردگی کو نشاط بھری زندگی میں بدل دینے میں کیا مضائقہ ہے۔'' ۵۸؎

اس افسانے میں معاشرے کے ایک فرد کو پیش کیا ہے، جو کسی ذہنی اُلجھاؤ کا شکار ہے غربت تو نہیں ہے پھر بھی اُسے سکون میسر نہیں ایک دن اس نے تنگ آ کر اپنا سر زمین پر دے مارا اپنے آپ کو زخمی کیا جب اُسے ہوش آیا تو خود کو آگ لگا کر خودکشی کر لی اور خود کو اس دنیا سے آزاد کر لیا جب وجہ پوچھی گئی تو بے روزگاری بتائی گئی جس وجہ سے اس نے یہ کام کیا اور اُسے سکون میسر نہیں تھا۔یہی واقعہ ایک لڑکی نازیہ کے ساتھ بھی پیش آیا کہ وہ ایک کمپنی میں ملازمہ تھی اور اپنے خاندان کی واحد کفیل تھی اُسے بھی ہر وقت غربت، بھوک، خاندان اور والدین کی فکر لگی رہتی تھی سوچ سوچ کر وہ ذہنی مریض ہو گئی تھی۔گھر والے اور محلے والے اس پر جن بھوت کا اثر ظاہر کرتے تھے لیکن اصل میں وہ غربت کا شکار تھی

اور اسی غم میں پریشان رہتی تھی ۔ ڈاکٹر ،حکیم اور تعویذ والوں کے پاس اس کا علاج نہ تھا۔لوگ اُسے پاگل سمجھتے دراصل وہ پاگل نہ تھی بل کہ حالات کے ہاتھوں مجبور تھی اُس نے زہر کھا کر اپنی زندگی ختم کر دی۔

مصنف نے کچھ ایسے لوگوں کا ذکر کیا ہے، جو دنیا کو بھُلا کر آپس میں نا جائز تعلقات قائم رکھے ہوئے ہیں ایک عورت نے اپنے خاوند کے گھر نہ ہونے پر پڑوسی کو بلایا وہ بھی خوف زدہ اور گھبرایا ہوا تھا اس سے یہ عورت کہنے لگی:

> ''خدارا تم نہ گھبراؤ میں ایک عرصہ سے اُلجھی ہوئی ہوں، مسلسل آگ میں جل رہی ہوں اِس تپش کو کوئی نام نہیں دے پا رہی، جب سے تم مجھے ملے کچھ ڈھارس بندھی۔اب تم تو میرا سکون غارت نہ کرو۔'' ۵۹

وہ اُسے سمجھاتے ہوئے کہنے لگا:

> ''دیکھو تمھارا خاوند ایک شرف اور محنتی آدمی ہے سارا سارا دن اور کبھی کبھار رات بھر کام کرتا ہے۔'' ٦٠

لیکن عورت کو ان باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑا وہ ان تمام باتوں کو پس پشت ڈال کر گناہوں کی اور گندگی کی زندگی میں چلے گئے ۔مصنف نے ان کے ذریعے معاشرتی برائی کو بے نقاب کیا ہے اور اس کے ذریعے حقیقت کے ایک نہیں کئی پہلو دکھائے ہیں جس سے زندگی کی مختلف جہات کے ساتھ انسانی رویوں، سوچ اور فکر کے متنوع حوالوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

ساجد خان نے اس افسانے میں جنس کو بھی موضوع بنایا ہے جو انسان کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے یہ پہلو ان کے افسانوں میں انسانی جبلت کے نئے روپ کے طور پر سامنے آتا ہے اس کو سمجھنا اتنا آسان اور عام فہم نہیں۔ خاص طور پر عورت کے جذبات اور احساسات کے حوالے سے اس کی نفسیاتی رویوں کو پیش کرنا انھوں نے عورت کے جذبات کو بڑی بے باکی اور جرأت سے پیش کیا ہے۔لکھتے ہیں:

> ''رات کھانے سے فراغت کے بعد کافی دیر تک وہ ایک کمرے میں رہے اِس دوران جسم جسم کا ہم راز بنا رہا،اس کی گردن کی نسیں قدرے اُبھر گئی تھیں، ہاتھ اُبھر چکے تھے

،آنکھوں کے سامنے چھریرا بدن اپنی رعنائیوں کے ساتھ بازوں کے حلقے میں سمٹ کر سینے میں ٹھنڈک کا سماں پیدا کر رہا تھا۔تھرکتا، چھلکتا،سفید بدن آتش فشاں کی طرح ابل رہا تھا۔رس بھرے ہونٹ نم ہو چکے تھے۔جسم کی تپش ماتھے سے پسینے کی صورت نمودار ہوئی ہونٹوں میں سرخی اور وجود میں حدت محسوس ہونے لگی۔رخساروں، ہونٹوں اور پھر گردن پر اس کے کئی نشانات ثبت ہو چکے تھے دونوں ہی مستی کے عالم میں پوری طرح محور ہے تھے اس قدر مخمور کے دنیا سے بے نیاز باہم ایک جان دو بدن۔''۶۱؎

آگے چل کر عورت کی نفسیات اور اس کے جذبات بارے لکھتے ہیں جو اُسے بار بار اُبھار رہے تھے۔

''وہ اُسے اپنے ساتھ بھینچ کر کہنے لگی میں اُس وقت تم کو دیکھا کرتی تھی اور اکثر تمھارے فون پر میسج کر کے تم سے کہتی بھی رہی تھی پر تم مان نہیں رہے تھے، تمھارے پیار کا انداز مجھے بہت پسند تھا کاش وہ وقت جو تم نے اس کے ساتھ گزارا، میرے ساتھ گزارا ہوتا ،آج میری اُلجھن ختم ہوتی، مجھے قرار نصیب ہوا میرے اندر کا اضطراب اپنے انجام کو پہنچا۔''۶۲؎

اس افسانے میں مصنف نے دوسرا پہلو اُجاگر کیا ہے کہ معاشرے میں بعض لوگوں کو دو وقت کا کھانا نہیں ملتا اور بعض لوگ شادی پر لاکھوں روپے لگا دیتے ہیں جس میں مختلف کھانوں کے علاوہ کھلے عام شراب کا پینا پلانا خواہ مخواہ ہوئی فائرنگ کرنا۔اپنی جھوٹی شان وشوکت کو ظاہر کونے کے لیے کسی کی پرواہ نہیں کرتے اگر یہی فضول خرچی کا پیسہ محلے کے غریبوں کو دیا جائے تو اُن کی فاقہ کشی ختم ہوسکتی ہے لیکن اس طرف امیروں کا دھیان ہے نہ وزیروں کا، ہر ایک اپنی موج مستی میں غرق ہے۔

مصنف نے ایک طرف اپنے محلے، گاؤں، ملک کی بھوک کے اور غلط فرسودہ رواج کے بارے میں لکھا ہے تو دوسری طرف دیگر مما لک، جو اپنی دولت اور وسائل کی وجہ سے چوہدری بنے بیٹھے ہیں ان کے جبر و استبدا اور لوٹ کھسوٹ کے بارے میں بھی لکھا ہے۔کسی بڑے مما لک کی بھوک چھوٹے ملک پر تباہی مچانے ، بم بلاسٹ کرنے ،امن خراب کرنے، اپنی چودھراہٹ کو دوسروں پر ٹھونسنے کے لیے اس طرح کے کام کرتے ہیں جیسے عراق، بوسنیا، فلسطین اور دوسرے مسلمان مما لک میں بڑی طاقتیں اپنی مختلف قسم کی بھوک مٹانے کے لیے لگی ہوئی ہیں۔اس وقت سب سے زیادہ چودھراہٹ قائم کرنے کی بھوک نہیں بل کہ پیٹ کی بھوک مٹانے کے لیے کچھ غور وخوض کرنے کی

ضرورت ہے۔ وہ خود بھی حیران و پریشان ہے کہ آخران دکھوں کا علاج کیا ہے کتابیں، رسالے پڑھنے سے، ٹی وی دیکھنے سے سب یہی چیخ پکار کر رہے ہیں کہ فلاں ملک نے دوسرے ملک پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے۔ اسلحہ کی دوڑ ہے ہر کوئی اپنی تجوری بھرنا چاہتا ہے دوسرے کا کوئی خیال نہیں رکھتا۔ ٹی وی پروگرام بھی دہشت گردی، چوری، ڈاکا زنی، عصمت فروشی، ملاوٹ، ایک دوسرے کا ناحق گلا کاٹنے اغوا برائے تاوان سے بھرے پڑے ہیں لیکن مثبت سوچ کسی کے پاس نہیں ہے۔

سارے کا سارا معاشرہ اسی غلاظت میں ہے ہر طرف یہی واقعات دیکھنے کو ملتے ہیں اور ایسے واقعات ہیں جو معاشرے میں ہونے والے عجیب وغریب خیالات، فحاشی ہر طرف پھیلی ہوئی ہے جو ماحول کو آلودہ کر رہی ہے۔ مصنف نے اس افسانے میں اپنے اردگرد ہونے والی بُرائیوں سے پردہ اُٹھایا ہے اور کڑوا سچ ہمارے سامنے لایا ہے۔

افسانہ ''دائروں میں بٹی زندگی'' ایک ایسی کہانی ہے، جس میں انسان بہت سے مسائل سے دوچار ہے ان کی زندگی تقسیم ہوگئی ہے اس افسانے میں مصنف کو راہ چلتے چلتے ایک اجنبی آدمی ملا اُس نے اپنا مسئلہ اور دُکھ سنانے کے لیے اس کے گھر آنا چاہا۔ جب بار بار وہ اسے ملا تو یہی تقاضا کیا کہ وہ گھر جا کے اُسے اپنا مقصد بیان کرے گا۔ مصنف نے اس افسانے میں یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے آنے والے حالات و واقعات اور تعلقات کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ جب تک اس اجنبی شخص نے اپنا مقصد بیان نہ کیا اُس وقت تک مصنف کو یہ گمان رہا کہ وہ اس سے کچھ پیسوں کا متقاضی ہے لیکن راہ چلتے چلتے یا سرِ راہ ملتے ہوئے اپنا مقصد بیان کرنے سے گریز کرتا رہا۔

جب ایک دن وہ ملاقات کے لیے صبح سویرے مصنف کے گھر آ ٹپکا تو اس نے بُرا بھی منایا کہ یہ اجنبی کیا چاہتا ہے لیکن وہ اتنے مسائل میں گھیرا ہوا تھا کہ اُسے اپنا حال بتانا چاہتا تھا۔ جب اس نے دروازہ کھولا۔ دعا سلام کے بعد اس کو بٹھایا، چائے پلائی اور یہ کہا کہ میرے ساتھ تمھارا کیا تعلق ہے اور مقصد کیا ہے۔ جب اس نے اپنا تعارف کروایا اور کہا کہ میں پڑھا لکھا نوجوان ہوں۔ آپ اچھے لکھاری ہیں میں آپ کی کہانیاں پڑھتا ہوں گھر کے اخراجات بہت زیادہ تھے، نوکری نہیں ملی آگے بڑھنا چاہتا تھا لیکن ممکن نہیں تھا۔ وہ کچھ اس طرح کہتا ہے:

> ''معاشرے میں زندہ رہنے کے لیے ہاتھ پاؤں تو مارنے پڑتے ہیں۔ میں نے ایف اے کے بعد کئی محکموں میں نوکری کے لیے درخواست دی۔ جب کچھ نہ بن پڑا تو سبزی منڈی میں پڑاؤ ڈالا بیس سال ہو گئے میں منڈی میں کام کر رہا ہوں۔ بابو صاحب میں

نے زندگی میں حلال کمانا اور بچوں کو حلال کھلانا ہی جائز سمجھا ہے۔''۶۳؎

اس افسانے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کسی شخص کے بارے میں اندازہ نہیں لگانا چاہیے شاید وہ آپ کی سوچ سے بالکل مختلف ہو۔ یہ شخص معاشرے کا ایک فرد ہے جس نے نوکری نہ ملنے پر ٹھیلہ لگایا ہوا ہے اور گھر والوں کی کفالت کرتا ہے، بہت سارے مسائل میں پھنسا ہوا ہے اور وہ یہی کہہ رہا ہے کہ مجھ پر کچھ لکھا جائے۔ وہ بھی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے بہت سے مسائل کا شکار ہے اور وہ ان مسائل سے نکلنے کے لیے راستہ ڈھونڈ رہا تھا۔ مثل مشہور ہے کہ وہ تو کولو کا بیل ہے۔ یہ شخص بھی دن رات کولو کے بیل کی طرح سارا دن کولو میں جُتا رہتا ہے وہ گھوم پھر کر اُسی جگہ آجاتا ہے جہاں اُس نے گول چکر میں اپنا سفر صبح سے شروع کیا تھا وہ دائرے کا اسیر ہے جس سے وہ نکلنا چاہتا ہے لیکن وہ نکل نہیں سکتا۔ وہ اپنی پوری روداد سنا چکا ہوتا ہے تو لکھاری اس کے بارے میں سوچتا ہے کہ:

''مجھے ایسا معلوم ہوا۔ وہ عمر قید بامشقت کاٹنے والا کوئی قیدی ہے کبھی ایسا لگتا کہ وہ کسی ریل کا مسافر ہے جس کی کوئی منزل ہی نہیں، بس کبھی اِدھر، کبھی اُدھر سفر کیے جارہا ہے۔ کبھی یہ تاثر اُبھرتا کہ وہ معاشرے کی وہ چیخ ہے جو چلاتے چلاتے اپنے اندر ہی بھسم ہو کر رہ گئی ہے تو کبھی یوں لگا، وہ صبح شام گزارے جارہا ہے پھر کبھی ایسا گمان گزرا کہ وہ کسی ریاست کا بادشاہ ہے، جس کی ریاست میں ملکہ اور اس کے شہزادے، شہزادیاں صرف اُسی کی چاہت میں جی رہے ہیں۔''۶۴؎

جب اُس نے قلم اور قرطاس لکھنے کے لیے تیار کیے پھر یکا یک خیال آیا کہ لکھوں تو کیا لکھوں کہ یہ سبزی فروش ہی مصیبتوں کا قیدی نہیں ہے بل کہ اولادِ آدم جس میں ہم سب شامل ہیں کولو کے بیل کی طرح بے مقصد چل رہے ہیں، زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہے اور اس کے بغیر کام کر رہے ہیں ہمارا سفر صحیح سمت میں نہیں ہے۔ ہم لالچ، جھوٹ اور خودغرضی کے منصوبوں سے باہر نہیں نکلیں گے اس وقت تک کسی کو عافیت نہیں ہوسکتی یہاں کسی کو امیر ہونے پر غرور ہے تو کوئی غریب ہونے کو کوستے رہتے ہیں۔ کوئی اپنی خواہشات کو تو کوئی اپنے خوابوں کی تکمیل میں جُتا ہوا ہے ہر کوئی مختلف مسائل کے دائروں میں پھنسا ہوا ہے۔ وہ کہتا ہے:

''کوئی اپنے کرب کو چھپاتے ہوئے دائروں میں دیوانہ وار گھومے جارہا ہے، کسی کے

> چہرے کی کملاہٹ اُس کے اضطراب کو عیاں کر رہی ہے وہ دائرے کے خول سے تنگ اس قید سے خلاصی چاہ رہا ہے۔دائرے آدم کو مختلف حصوں میں بانٹے اس کھیل سے محظوظ ہو رہے ہیں۔آدم دائروں میں بٹی زندگی میں ہی کہیں، وقت کے تھپیڑے کھاتا، منہ بناتا، زخم سہلاتا، چیختا چلاتا، شور مچاتا۔انجانی منزل کی تلاش میں سرگرداں آگے بڑھے جا رہا ہے۔''۶۵

اگر ہم نے دنیا میں آسودگی اور آرام کے ساتھ جینا ہے تو اپنے اردگرد کے لوگوں کو مثبت سوچ کے ساتھ لے کر آگے بڑھنا ہوگا۔لالچ، اَنا اور خودغرضی کے دائرے سے نکلنا ہوگا ورنہ ساری زندگی انہی مسائل سے دوچار رہیں گے اور مقصد کو نہیں پہنچ سکیں گے اس دور میں ہر کسی کی زندگی کسی نہ کسی دُکھ، پریشانی میں مبتلا ہے ہر کوئی اس سے خلاصی چاہتا ہے اس کی زندگی ان آفات کے ذریعے تقسیم ہو کر رہ گئی ہے۔

افسانہ''مردہ خانہ''میں صبر کرنے والوں کے لیے پھل اور معاشرے میں ایک دوسرے پر تنقید کرنے والوں اور اپنی اصلاح نہ کرنے والوں کا ذکر کیا ہے۔اس کہانی میں مصنف عجیب تذبذب کا شکار ہے ایک خیالی عورت اس کے ساتھ کبھی کبھی باتیں بھی کرتی ہے جس سے اس کا دل مطمئن بھی ہو جاتا ہے اس کی محبوبہ کا خوبصورت چہرہ، لمبی لمبی زلفیں اور ایک عجیب سی کیفیت اس کے دل میں شعلے کی طرح بھڑک رہی تھی چاہتا تھا کہ شرافت اور عقل کی تمام سرحدیں ایک دم کوئی پرواہ کیے بغیر پار کر جائے لیکن اپنی ان خواہشات پر قابو رکھا اور صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔وہ عورت اس سے عمر میں بھی زیادہ تھی اور تجربے میں بھی بہت آگے تھی۔اس کے دل میں عورت کی عمر زیادہ ہونے کے باوجود دل اس کی طرف راغب تھا وہ چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ کہیں دور وادیوں میں گھومے پھرے محبت بھری باتیں کرے لیکن وہ دنیا کو چھوڑ نہ سکتے تھے کیوں کہ دنیا کے رسم و رواج، طور طریقے اور معاشرے کا رویہ اُسے اجازت نہ دیتا تھا۔ہاں یہ ضرور تھا کہ وہ گھنٹوں کھڑے باتوں کے علاوہ محبت اور الفت کی باتیں بھی کرتے تھے وہ باتوں باتوں میں اپنے دل کی بھڑاس نکالتا تھا۔لہٰذا اس نے کھوئی ہوئی جنت کو پانے کے لیے کمر باندھ لی اور چاہا کہ اس دنیا سے اُٹھ کر اگلی جنت والی دنیا میں منتقل ہو جاؤں۔بے خودی کے عالم میں اس نے محبوب کا ہاتھ پکڑا محبت کے ساتھ اُسے دبایا، جس سے اس کے جسم میں گناہ کی اور مصنوعی لذت کی بجلی کوند گئی جب اس کی محبوبہ نے اس کو محبت میں سرشار دیکھا، آنکھوں میں محبت کا خمار دیکھا کہ وہ بھٹکنے والا ہے، شرافت کی حد کو پار کرنے والا ہے۔اس عورت نے اسے تلقین کرتے ہوئے کہا کہ اصل رشتہ روح اور بدن کا ہے جس کا مطلب ہے کہ دنیا کی تمام لذتیں یہ مزے خاکی انسان کے ساتھ

خاک میں مل جائیں گے روح جسے قدرتی دوام ہے اسے چھوڑ کر دوسری دنیا میں چلی جائے گی یہ وہ دنیا ہے جو زندہ انسان نے نہیں دیکھی خاکی جسم کے جدا ہوتے ہی اس کا تعلق عالمِ ارواح سے ہو جاتا ہے اس نے اپنی محبوبہ سے اقرار کیا میں تمھیں دل و جان سے چاہتا ہوں ہمیشہ آپ کے ساتھ رہا اور آئندہ بھی رہوں گا اگر چہ میرا خاکی جسم دنیا کی لذت حاصل کر کے اپنے انجام کو پہنچ جائے میری محبت اور روحوں کا ساتھ اگلی دنیا تک رہے گا۔اور زندگی کے بارے میں یوں کہتا ہے:

''زندگی، ہاں زندگی، جسم اور روح کا حسین امتزاج، روح جس کو اب تک سفر کرنا ہے اور جسم جس نے لذتوں کو سمیٹ کر انجام کو جا پہنچنا ہے۔جسم اپنی لذتوں کی خاطر مسلسل پامال ہوئے جا رہا تھا، کبھی سکون کے نام پر، کبھی منزل پا لینے کی خاطر، کبھی خوشی اور شادمانی کے حسین دھوکے میں مبتلا ہو کر۔''۲۶

مصنف نے اس افسانے میں جنت کے نظارے کے بارے میں بھی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے وہ اپنے محبوب سے مخاطب ہے کہ ہم ایسی دنیا میں چلے جائیں گے جہاں مل کر بچھڑنے کا کوئی وہم و گمان نہ ہو گا ہر ایک شے اپنے قرینے کے ساتھ مزین ہو گی ہر کیاری کا پھوم اور ٹہنی کی کلی الگ الگ خوبصورتی اور رعنائی کا جیتا جاگتا پیکر ہو گی کھلی فضا میں ہم سانس لیں گے کوئی روک ٹوک نہ ہو گی آپ کا سہانا بدن، نوری لباس اور لمبے شانوں پر بکھرے کاکل یہ سب خوشی اور مسرت میں اضافہ کرتے رہیں گے۔اس کے ساتھ ہی ساجد خان نے جنت کی وسعتوں کا ذکر بھی کیا ہے ہم یہاں جو نئے کام کرتے ہیں۔دن رات تسبیح کے دانے اللہ کا نام لے کر گنتے رہتے ہیں اس کا ہمیں ضرور بخشش اور قرب والا صلہ ملے گا۔ہم جنت میں دنیا کی طرح پابندِ سلاسل نہ ہوں گے جہاں چاہیں گے، جدھر چاہیں گے ہوا کے دوش پر ادھر سے اُدھر بغیر وقت ضائع کیے پہنچ جائیں گے۔ہم ایسی دنیا میں جائیں گے جس میں ہمیں بچھڑنے اور ہجر کا کوئی خوف ڈر نہ ہو گا اور یہ ایسی صورت میں ممکن ہے جب دنیا کی خواہشات اور چند لمحوں کی لذت کو ترک کرنا ہو گا تب ہی اس کے قابل بن سکتے ہیں اس دنیا میں صبر کے ساتھ رہنا ہو گا۔دنیا میں صبر کرنے والوں کے متعلق لکھا ہے:

'صبر و استقامت پر چلنے والے کبھی ناکام نہیں ٹھہرتے دیر سے سہی پر منزل پا لیتے ہیں۔پھر ارفع مقام ان کی قدم بوسی کرتا ہے۔امید و ارِ یقین کے درمیان ایک عالی مقام ہے۔وہ مقام ہمارا ہے، ہم اپنا مقام پا کر نہال ہو جائیں گے، چاند، ستارے ہمارے اردگرد طواف کریں گے۔اُن کی روشنی ہماری روشنی کے سامنے ماند پڑھ جائے

گی۔''۷۶؎

آ گے چل کر پھر حقیقی دنیا کی بات ہے اس کی محبوبہ خوبصورتی کا پیکر بنی ہوئی اس کے سامنے بیٹھی ہے جس کی ہر ادا پر قربان ہونے کو جی چاہتا ہے پھر وہ ازدواجی زندگی میں بندھ جاتے ہیں ان دونوں کی شادی سے محلے کی عورتوں نے طعنے دینے شروع کر دیے کہ اس کالی کلوٹی نے اس کو اپنے جال میں پھنسا کر شادی کر لی حالانکہ اُن کی عمروں میں دور دور کی مماثلت نہیں ہے چونکہ اس عورت کا خاوند ابھی نوجوان ہے اس کے مقابلے میں یہ اُدھیڑ عمر لگتی ہے۔اور جوڑ بھی بالکل مناسب نہیں ہے اِسی طریقے سے عورتوں نے ان کے بارے میں بُرے بُرے خیالات کا اظہار کیا جیسے عورتوں کی عادت ہے کہ جب وہ کام کاج سے فارغ ہو کر اکٹھی بیٹھتی ہیں تو جہاں بھر کی باتیں سنتی اور سناتی ہیں ان کی تلوار جیسی زبان سے نہ ادنیٰ کو چھوڑتے ہیں نہ ہی اعلیٰ کو چھوڑتے ہیں جو بھی جی میں آتا ہے کہہ ڈالتی ہیں لیکن اپنے گھروں پر ایسی کوئی بات نہیں کر سکتیں۔

اس افسانے میں معاشرے کی ایسی بُرائی کی طرف اشارہ کیا ہے جسے غیبت کہہ سکتے ہیں کہ ہم دوسروں کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر اور برائیوں پر دن رات نکتہ چینی کرتے رہتے ہیں کوئی بڑا، چھوٹا، ادنیٰ، اعلیٰ ان کی تنقیدوں سے نہیں بچ سکتا لیکن افسوس کی بات ہے کہ ہم اپنے گریباں میں جھانک کر نہیں دیکھتے کہ ہمارے اندر کتنی غلاظت، بے ایمانی، کھوٹ کے انبار لگے ہوئے ہیں جس سے ظاہر اور باطن کی دنیا روز بروز سیاہ ہو رہی ہے کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ ہمیں دوسرے کی آنکھ کا تنکا تو نظر آتا ہے لیکن اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا۔سب سے پہلے اپنی اصلاح ہے بعد میں دوسروں کی اصلاح کا بیڑا اُٹھانا ہے۔

ساجد خان کے افسانے موجودہ دور کے ہونے والے واقعات کی بھر پور ترجمانی کرتے ہیں انھوں نے اردگرد کے حوادثات کو گہرے مشاہدے سے دیکھا اور ہمارے سامنے پیش کیا انھوں نے معاشی و معاشرتی مسائل کو اُجاگر کیا ہے اور انسانوں کے ایسے رویے پیش کیے ہیں جو ان کی نفسیات سے تعلق رکھتے ہیں ایسے ایسے دلچسپ واقعات پیش کیے ہیں جن کو قاری پڑھے بغیر نہیں رہ سکتا دراصل وہ معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں دوسروں کے دُکھ تکالیف کو اپنے اوپر طاری کر لیتے ہیں وہ سارا درد خود پر ہونا محسوس کرتے ہیں اسی وجہ سے اُن کے افسانوں اور کہانیاں آپ بیتی لگتی ہیں جو جگ بیتی بھی ہیں ان کی کہانیوں میں ان کی فکر نے معاشرے کی برائیوں سے پردہ اُٹھایا ہے۔اس ضمن میں ڈاکٹر وسیم انجم لکھتے ہیں:

''معاشی مسائل نے معاشرتی مسائل کو جنم دیا ہے اور خانگی مسائل نے بھی زندگی اجیرن

کر دی ہے۔ یہ مسائل انسانی زندگی کو دیمک کی طرح کھائے جا رہے ہیں۔ساجد خان
کی کہانیاں ایسے ہی مسائل کی نہ صرف نشاندہی کرتے ہیں بلکہ ان کا حل بھی پیش کرتی
ہیں۔''٦٨

ان کے افسانوں میں اپنی سرزمین کے آس پاس جتنے بھی انسان رہتے ہیں انھوں نے ان کی نفسیات کا بغور مطالعہ کیا اور ایسی کہانیاں تخلیق کیں جو ان کے رویوں کو پیش کرتی ہیں۔اُن کی کہانیاں خطیبانہ انداز کے ساتھ گہری سوچ وفکر کی پیداوار ہیں۔دنیا میں ہونے والی برائیاں گندے اور غلیظ لوگ جو اس معاشرے اور دنیا کو گندا کر رہے ہیں اس کو بیان کیا ہے۔ان کے افسانوں کے بارے میں ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں:

''ساجد خان کے بعض افسانوں کی قرأت کے بعد میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ ایک ایسا تخلیقی فنکار ہے جس نے علوم اور علم کے ضابطوں کی حدود سے بہت آگے نکل کر اُن رمز بھرے حقائق کو گرفت میں لیا کہ جن پر دسترس حاصل کرنا ہر لکھنے والے کا نصیب نہیں ہوتا۔اس کی انفرادیت یہ ہے کہ اُس نے افراد کے جن ابنارمل روّیوں کو پیش کیا ہے ان میں سے چند ایک ایسے نازک روّیے ہیں کہ جو ابھی تک نفسیات کی اصطلاحوں کی گرفت میں نہیں آ سکے۔ساجد خان کے ہاں تکنیکی تنوع موجود ہے جس کی بدولت وہ خارجی مظاہرِ فطرت کے ساتھ لاشعوری اور تحت الشعوری مظاہر کو بھی سہولت کے ساتھ کاغذ پر اُتار لیتا ہے ان کے افسانوں میں باطن کا سفر ایک نئے صوفیانہ آہنگ کی پہچان کراتا ہے۔اس کا کمال یہ ہے کہ وہ تکنیکی ندرت کے ساتھ مشکل ترین مرحلوں سے با سہولت گزر جاتا ہے۔ساجد خان کی لفظوں پر گرفت بھی خاصی مضبوط ہے اور وہ کہیں بھی افسانوی ادب میں نو وارد ہونے کا تاثر نہیں چھوڑتا۔''٦٩

ساجد خان کا ایک وصف یہ بھی ہیکہ اسکا ہر افسانہ دوسرے افسانہ سے یکسر مختلف ہے بلاشبہ ساجد خان نے افسانوں میں اپنے معاشرے کی برائیوں کو اُجاگر کیا ہے ان کی فکر ان کے افسانوں میں دیکھی جا سکتی ہے انھوں نے اپنے نظریات اور گہرے مشاہدے کی بدولت افسانے تحریر کیے ہیں ان کے افسانے انسان دوست افسانے ہیں اور معاشرے میں پیدا ہونے والے ناسوروں کی نشاندہی کرتے ہیں خواہ وہ بُرائیاں سیاسی، سماجی، اخلاقی، معاشرتی ہوں ان سے چھپ نہیں سکتیں آج کے دور میں بے شمار برائیاں ہیں۔رشتوں میں بے اتفاقی وغیرہ غرض ان گنت مسائل ہیں جن سے

انسان دوچار ہیں ۔اُس نے ان سب موضوعات کو پیش کیا ہے ساجد خان آزادی اور انسانی دوستی کا نظریہ رکھتے ہیں ۔اس کے علاوہ وہ نوجوان جو بے روزگاری کی وجہ سے خودکشی کر کے اس دنیا سے ،دنیا کے تمام مسائل سے چھٹکارا حاصل کرتے ہیں ان کے اندر جذبہ پیدا کرنے اور انہیں خود اعتماد بناتے نظر آتے ہیں ۔کیوں کہ وہ انسان سے بے حد محبت کرتے ہیں اسے کائنات کا حصہ جانتے ہیں اور کائنات کی تمام ترقی کا راز انسان ہی کو سمجھتے ہیں ۔اس لیے لوگوں کو مسائل اپنے اوپر طاری کر کے افسانوں کو تخلیق کرتے ہیں ۔یہی اُن کے فن کا کمال ہے، اس پر اُن کا اسلوب سہاگے کا کام کرتا ہے ۔جس کی وجہ سے قاری تا دیر کہانی کے سحر سے نکل نہیں سکتا۔

حوالہ جات:

۱۔محمد بشیر رانجھا،ساجد خان فکر وفن،سلطان پبلشرز،راولپنڈی،۲۰۱۹ء،ص۶۶

۲۔ایضاً،ص۵۹

۳۔ابوالاعجاز حفیظ صدیقی،کشاف تنقیدی اصطلاحات،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد۔۱۹۸۵ء،ص۱۳۶

۴۔محمد بشیر رانجھا،ساجد خان فکروفن،ص۲۸

۵۔دردآشوب،احمد فراز،خالد اکیڈمی،پبلشرز کالج روڈ،راولپنڈی،س۔ن،ص۲۲

۶۔ محمد بشیر رانجھا،ساجد خان فکروفن،ص۳۱

۷۔ایضاً،ص۴۸

۸۔ایضاً،ص۵۶

۹۔ایضاً،ص۵۷

۱۰۔ساجد خان،دائرے کا اسیر،سلطان پبلشرز،راولپنڈی،۲۰۱۴ء،ص۷،۸

۱۱۔ایضاً،ص۸

۱۲۔ایضاً،ص۸

۱۳۔ایضاً،ص۱۱

۱۴۔ایضاً،ص۱۱

۱۵۔ایضاً،ص۱۱

۱۶۔ایضاً،ص۱۱

۱۷۔ایضاً،ص۱۲

۱۸۔ایضاً،ص۱۲

۱۹۔ایضاً،ص۱۸

۲۰۔ایضاً،ص۱۹

۲۱۔ایضاً،ص۲۰

۲۲۔الملک عبداللہ بن عبدالعزیز آل مسعود،القرآن کریم مع اُردو ترجمہ وتفسیر،س۔ن،ص۱۲۴۳

۲۳۔ساجد خان،دائرے کا اسیر،ص۲۴

۲۴۔ایضاً،ص۲۵

۲۵۔ایضاً،ص۲۷

۲۶۔ایضاً،ص۲۷

۲۷۔ایضاً،ص۳۲

۲۸۔ایضاً،ص۴۰

۲۹۔ایضاً،ص۴۱

۳۰۔علامہ اقبال،کلیات اقبال،نیشنل بک فاؤنڈیشن،اسلام آباد،۲۰۱۸ء،ص۳۷۲

۳۱۔ساجد خان،دائرے کا اسیر،ص۴۷

۳۲۔ ایضاً،۴۷

۳۳۔ ایضاً،ص۵۰

۳۴۔ایضاً،ص۵۲

۳۵۔ایضاً،ص۵۳

۳۶۔ایضاً،ص۵۴

۳۷۔علامہ اقبال،کلیات اقبال،ص۳۷۲

۳۸۔ساجد خان،دائرے کا اسیر،ص۶۰

۳۹۔ ایضاً،ص۶۱،۶۲

۴۰۔ ایضاً،ص۶۶

۴۱۔ایضاً،ص۶۸

۴۲۔ایضاً،ص۶۸

۴۳۔ایضاً،ص۷۱،۷۲

۴۴۔علامہ اقبال،کلیات اقبال،ص۳۵۱

۴۵۔ساجد خان،دائرے کا اسیر،ص۷۳

۴۶۔ایضاً،ص۷۴

۴۷۔ایضاً،ص۷۸

۴۸۔ایضاً،ص۸۱

۴۹۔ایضاً،ص۸۲

۵۰۔ایضاً،ص۸۳

۵۱۔ایضاً،ص۸۳

۵۲۔ایضاً،ص۹۵

۵۳۔ایضاً،ص۹۶

۵۴۔ایضاً،ص۹۹

۵۵۔ایضاً،ص۹۹

۵۶۔ایضاً،ص۱۰۳

۵۷۔ایضاً،ص۱۰۴

۵۸۔ایضاً،ص۱۰۴

۵۹۔ایضاً،ص۱۰۸

۶۰۔ایضاً،ص۱۰۸

۶۱۔ایضاً،ص۱۱۳

۶۲۔ایضاً،ص۱۱۴

۶۳۔ایضاً،ص۱۱۹

۶۴۔ایضاً،ص۱۲۱

۶۵۔ایضاً،ص۱۲۱،۱۲۲

۶۶۔ ایضاً،ص۱۲۵

۶۷۔ایضاً،ص۱۲۶

۶۸۔محمد بشیر رانجھا،ساجد خان فکر و فن،ص۶۰

۶۹۔ساجد خان،دائرے کا اسیر،ص۱۳۰

بابِ چہارم:

افسانوی مجموعہ ’’دائرے کا اسیر‘‘
فنی مطالعہ

فنی مطالعہ:

تخلیق کار اپنے فن سے اپنی تحریر میں نکھار پیدا کرتا ہے وہ معاشرے کی عکاسی ایسے کرتا ہے کہ قاری بھی اس کو محسوس کرتا ہے۔ وہ اپنے اردگرد ہونے والے واقعات کو مختلف فنی مراحل سے گزار کر اس میں دلچسپی پیدا کر کے پیش کرتا ہے پلاٹ، زبان و بیان سے تحریر میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔ کوئی بھی فن کار اپنی کہانی تحریر کرنے کے لیے فنی محاسن کو ذہن میں رکھتا ہے کیوں کہ اس کے بغیر کہانی کا مزہ کرکرا سا ہو جاتا ہے اور قاری پر مطلوبہ اثرات مرتب نہیں کر پاتا دراصل یہ فنکار ہی ہوتا ہے، جو حالات و واقعات کو باریک بینی سے مشاہدہ کرتا ہے اور زندگی کی ایسی تصویریں سامنے لاتا ہے جو خوشی یا غمی پر مبنی ہوتی ہیں۔ اس ضمن میں ابوالاعجاز حفیظ صدیقی یوں رقمطراز ہیں:

> ''فن کی کوئی جامع و مانع تعریف ممکن نہیں البتہ فن کے بنیادی خصائص یہ ہیں:
> ۱۔ زندگی یا حقیقت کی ایسی عکاسی یا ترجمانی جو مسرت بخشی پر منتج ہو۔
> ۲۔ صرف اظہار پر اکتفا کرنے کے بجائے حسنِ اظہار کی شعوری کوشش ہو۔
> ۳۔ فنکار کو اپنی شخصیت کا پرتو جس میں اس کا سماجی شعور بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔
> ۴۔ فنکار کی تخیل کا شمول جو زندگی کو زیادہ بھرپور شکل عطا کرتا ہے۔
> ۵۔ اپنے خلقہ خطاب (سامعین، ناظرین یا قارئین) کا واضح احساس جو ابلاغ پر منتج ہے۔''[۱]

شاعر و ادیب دیگر لوگوں کے مقابلے میں زیادہ حساس اور باریک بیں ہوتا ہے اور اپنے اردگرد ہونے والے واقعات پر گہری نظر رکھتا ہے اور تمام فنی مہارتوں کے ساتھ اسے قرطاس پر یوُں منتقل کرتا ہے کہ قاری اُسے پڑھ کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگر وہ فنی تقاضے پورے نہ کرے تو اپنے مشن میں ناکام رہتا ہے۔ ساجد خان نے اپنی تحاریر میں فنی نزاکتوں کو خوب برتا ہے اپنے اردگرد ہونے والے حوادثات کو دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں اور مختلف فنی مہارتوں سے ان حالات و واقعات سے آگاہ کرتے ہیں دراصل یہ ان کی فنی خوبی ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں زندگی کے مسائل کو پیش بل کہ اس کا حل بھی بتاتے ہیں ان کے اظہار میں اس قدر شگفتگی ہے جو بھی تحریر کرتے ہیں وہ ان کے فن پر مبنی ہوتا ہے۔ سماج میں ایسے رشتے جو اُسے پریشان کرتے ہیں ہر طرف نفرت کے بازار گرم ہیں۔ جن کا علاج صرف اور صرف پیار اور محبت سے کیا جاتا ہے۔ ساجد خان ان سب چیزوں کو اپنی کہانی میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے فن کے بارے میں محمد بشیر رانجھا لکھتے ہیں:

''ساجد خان کا فن نہ تو جذبات وافکار کی پیچیدہ اکائیوں سے مرتب ہونے والا کوئی حل شدہ ریاضیاتی فارمولا ہے، نہ ہی کوئی امتحان پاس کرنے کے لیے گٹ تھرو گائیڈ اور نہ ہی اس کا تعلق دائیں بائیں کی منشور یاتی راہ عمل سے ہے۔ساجد خان اپنے بہت سے ہم عصر افسانہ نویسوں کی مانند سستی جذباتیت ،نرم و ملائم اظہاریت ،جنسی نشاطیت اور جسمانی مقناطیسیت کے حربوں سے کام لینے کو معیوب جانتا ہے اور سستی شہرت حاصل کر کے ٹیبل ٹاک بننا اس کا مسئلہ ہرگز نہیں ۔اس کے برعکس وہ اپنے گردو پیش کے حالات کی عذاب آفرینیوں میں فرد کی بے حسی اور اپنے خول میں سمٹ جانے کے عمل پر احتجاج کرتا ہے وہ کُچلی روحوں اور بے بس نسلوں کی زندگی کے حقیقی معانی جاننے کی اہمیت پر آمادہ کرنا چاہتا ہے۔''[۲]

کسی بھی فن کار کو کہانی کو تخلیق کرنے سے پہلے اُسے مختلف فنی مہارتوں سے آگاہی حاصل کرنا ضروری ہوتی ہے۔ساجد خان نے بھی اپنے افسانوں میں تمام فنی محاسن کو پیش نظر رکھا ہے وہ جو بھی لکھتے ہیں اس طریقے سے لکھتے ہیں قاری کو اُسے آخر تک پڑھے بغیر چارہ نہیں رہتا وہ قاری کو اپنے ساتھ لے کر چلتے ہیں اور وہ کچھ نہ کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔اس ضمن میں عمر علی دائم لکھتے ہیں:

''ایک اچھے افسانے کے لیے اختصار، اسلوب، وحدت تاثر، خیال آفرینی، کرداروں کا آپس میں ربط و آہنگ ، وحدتِ زماں اور جزئیات نگاری کی مناسبت کا ہونا بہت ضروری ہوتا ہے اور یہ تمام خوبیاں اللہ تعالیٰ نے ساجد خان کو بدرجہ اتم عطا کی ہیں۔''[۳]

ساجد خان ایک حساس طبیعت شخص ہیں ان کی یہ حساسیت ان کے افسانوں پر چھائی ہوئی ہے۔وہ اپنے گردو پیش دُکھ تکالیف کو اپنے اوپر طاری کر لیتے ہیں اور انہی سے کہانی تحریر کرتے ہیں جس میں اس کا فن نکھر کر سامنے آتا ہے وہ جو کچھ لکھتے ہیں وہ انسانوں کے غموں اور خوشیوں کی ترجمانی کرتا ہے اور اپنی تحریر میں بہت سی حسین پناگاہیں تخلیق کیں ہیں جو قاری کو اپنا ہم نوا بنا لیتی ہیں۔اس ضمن میں بشیر احمد سوز یوں رقمطراز ہیں:

''زندگی کھلی کتاب کی مانند ہے اس کے ورق ورق پر کہانیاں رقم ہیں مگر وہ جو دل کی آنکھ سے ان کہانیوں کو پڑھنے کا ہنر جانتا ہے وہی ان سے نئی کہانیوں کے لیے مواد حاصل کر

سکتا ہے۔گویا حساسیت فن کی تخلیق کا باعث بنتی ہے خواہ کہانی کی صورت میں جلوہ ریز ہو یا نغمہ وموسیقی کے سانچے میں ڈھلنے لگے۔فنون لطیفہ کی اساس ہی دراصل حساسیت ہے۔جس فنکار کے حصے میں جتنی حساسیت آتی ہے وہ اپنے فن پارے میں اُتنے ہی حسین رنگ بھرتا ہے۔''۴

ساجد خان کے افسانوں کے پلاٹ:

افسانے کے لیے پلاٹ بنیادی چیز ہے پلاٹ بنیادی طور پر ایک خاکہ یا ڈھانچہ ہوتا ہے جس کی مدد سے کہانی تخلیق کی جاتی ہے۔تخلیق کار اپنے مشاہدات، گردوپیش واقعات، کرداروں اور اپنے خیالات کو ڈھالتا ہے اور کہانی تخلیق کرتا ہے۔ایک اچھا پلاٹ کہانی میں دلچسپی پیدا کرتا ہے افسانہ نگار اپنی کہانی کے آغاز اور اختتام تک ایک ڈھانچہ تیار کرتا ہے جو اس کا پلاٹ ہوتا ہے۔پلاٹ دراصل ایک خاکہ،نقشہ،ڈھانچہ یا DPC ہوتا ہے جس پر پوری عمارت تعمیر ہوتی ہے۔یہ اگر ناقص اور کمزور ہو،تو پوری کہانی ہی ناقص اور کمزور رہے گی مضبوط پلاٹ کہانی کو افراط و تفریط سے بچائے رکھتا ہے اور صحیح سمت میں اُسے آگے بڑھاتا ہے۔اس ضمن میں رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

''افسانے کے لیے پلاٹ بھی ضروری ہے،واقعہ یا (واقعات) کا آغاز وارتقا یا پھر عروج یا منتہا (Climax) تک پہنچنا اور اس کے بعد ایک موزوں نتیجے پر ختم ہونا اسی ترتیب وتنظیم کا نام پلاٹ ہے۔''۵

کوئی بھی تخلیق کار اپنے گردوپیش میں ہونے والے واقعات کا گہرا مشاہدہ کرتا ہے اور اس واقعہ کو ایک خاص ترتیب سے آغاز کرتا ہے اور اس کو انجام تک پہنچاتا ہے یہی اس کی فنی خوبی ہوتی ہے افسانہ نگار کے ذہن میں کوئی بھی واقعہ یا خیال آتا ہے وہ اس کے مطابق اپنی کہانی کی شکل تیار کرتا ہے پھر اس کو تحریری شکل میں لاتا ہے۔اس ضمن میں سیّد وقار عظیم یوں رقمطراز ہیں:

''افسانہ نگار کے افسانہ کی بنیاد زندگی کے گوناگوں واقعات میں سے کسی ایک پر رکھی جاتی ہے کوئی ایک واقعہ،کوئی ایک موقع،کوئی ایک جذبہ،کوئی جذباتی یا نفسیاتی تحریک افسانہ نگار کے ذہن میں ایک موضوع پیدا کرتی ہے۔افسانہ نگار اس خاص موضوع کو پھیلا کر اس کا ایک ڈھانچہ تیار کرتا ہے۔افسانہ کا وہ بنیادی خیال یا تصور جس سے افسانہ

لکھنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے تھیم (Theme) کہلاتا ہے اس تھیم کی پھیلی ہوئی شکل
پلاٹ ہے۔''[6]

ساجد خان نے بھی اپنے گردوپیش میں رونما ہونے والے واقعات کا گہرا مشاہدہ کیا اور اسے ایک خاص ترتیب کے ساتھ پیش کیا ان کے افسانوں کے موضوعات ایک دوسرے سے مختلف ہیں ان کا ہر ایک افسانہ ایک الگ حیثیت رکھتا ہے ان کے پلاٹ میں کسی قسم کی کوئی پیچیدگی نہیں پائی جاتی انھوں نے افسانوں کے موضوعات اپنے ماحول سے لیے ہیں ان کیافسانوں کے بارے میں عادل سعید قریشی کا کہنا ہے کہ:

''ساجد خان کا ہر افسانہ ایک الگ موضوع رکھتا ہے لیکن اس کا اصل موضوع انسان دوستی اور معاشی انصاف کی تلاش ہے۔ساجد خان نے زندگی کو بڑے قریب سے دیکھا ہے اور پھر اس کی اپنی زندگی کے غم اور درد بھی اس کا حصہ بن کر اس کی کئی کہانیوں میں سامنے آتے ہیں۔اگر یوں کہوں کہ ساجد خان نے صرف جگ بیتیاں ہی نہیں بیان کیں اس کی آپ بیتی کے رنگ بھی اس کے افسانوں کا موضوع بنتے ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔''[7]

کردارنگاری:

ساجد خان اپنے کرداروں کی مدد سے مختلف موضوعات یا واقعہ کو لے کر کہانی تخلیق کرتے ہیں ان کی کہانیوں میں کرداراس کو ایک الگ فضا اور ماحول مہیا کرتے ہیں اور یہی اس کی فنی ریاضت ہے کہ ہمارے معاشرے میں پیدا ہونے والی برائیوں، سیاسی مفاد پرستی، معاشی اور معاشرتی اثرات وہ اپنے کرداروں کے ذریعے ان کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔افسانے میں واقعات اور کرداروں کے بارے میں سیّد وقار عظیم لکھتے ہیں:

''افسانہ نگار کچھ مخصوص کردار لے کر ان کی مصوری کرنا چاہتا ہے اور اس مقصد کے لیے وہ واقعات اور مواقع وضع کر کے کرداروں کا ارتقا دکھاتا ہے یا پھر کوئی واقعہ اس کے سامنے آتا ہے اور اس واقعہ یا موقع کی مناسبت سے کرداروں کو اس میں سمو لیتا ہے۔یا پھر کوئی خاص ماحول یا فضا اسے متاثر کرتی ہے وہ اس ماحول یا فضا کی ترجمانی کے لیے کوئی واقعہ اور اس موقع پر عمل کرنے والے کردار تراشتا ہے اور ان دونوں چیزوں کی مدد

سے اس ماحول یا فضا کا مجموعی تاثر پیدا کرتا ہے۔''[۸]

ساجد خان عام فہم اور زندگی کی اہم حقیقتوں کی عکاسی کرتے ہیں انھوں نے عام انسانوں کی کہانیاں لکھی ہیں اور یہ بتایا ہے کہ آج کل انسان سماج میں کیسے زندگی بسر کر رہے ہیں انہیں زندگی گزارنے کے سفر میں کون کون سے نئے دکھ، پریشانی اور تکلیف روزمرہ زندگی میں درپیش ہیں اور انسان ان کو کیسے برداشت کرتے ہیں ان سب چیزوں کی اس نے بڑی مہارت سے تصویر کشائی کی ہے۔

افسانہ ''مکافاتِ عمل'' میں ایک ایسی ہی کہانی ہے جس کا مرکزی کردار ملک وقار ہے جو ایک عورت سے محبت نہیں کرتا صرف اس کے ساتھ وقت گزاری کرتا ہے اور اس سے شادی نہیں کرتا جب عورت اس سے کہتی ہے:

''میں تم سے محبت کرتی ہوں تمھاری بن کے زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ اس میں کیا قباحت ہے؟''[۹]

تو ملک وقار اس عورت سے کہتا ہے:

''اوہو! تمھاری یہی بات میری سمجھ سے بالاتر ہے میں سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہا ہوں۔ دیکھو وہ دور کب کا گزر چکا، جب لوگ محبت کی کہانیاں پڑھا کرتے تھے محبت کے نام پر سرور حاصل کرتے تھے اور حقیقت سے دور کہیں خیالی دنیا آباد کر کے گھوما پھرا کرتے تھے۔ زمانہ بدل چکا ہے اب یہ سب باتیں بے معنی ہیں۔''[۱۰]

وہ عورت روہانسی ہو کر کہتی ہے:

''دیکھو، مجھے نہ چھوڑو! میں تم سے محبت کرتی ہوں، تمہارے بن رہ نہیں پاؤں گی''[۱۱]

ملک وقار اس سے یہ کہہ کر چپ کروا دیتا ہے:

''یہ سب جھوٹ ہے، تمھیں کسی سے محبت نہیں، تم جیسی عورتیں کسی کی بھی نہیں ہوتیں اور

نہ ہی محبت جیسے جذبے کو سمجھ سکتیں ہیں۔''[۱۲]

اس افسانے میں ملک وقار کا کردار معاشرے کا ہی ایک فرد ہے جو پیار محبت کے نام پر وقت گزاری کرتا ہے اور اس عورت کو ذلیل وخوار کرتا ہے جو اخلاق کے زمرے سے باہر ہے اِسی طرح افسانہ ''کل مونہی'' میں معاشرے کی ایک ایسی بُرائی کی نقاب کشائی کی ہے جو آئے روز کہیں نہ کہیں دیکھنے کو ملتی ہے اس میں دو مرکزی کردار ہیں صداقت اور نائلہ کا۔ جو ایک دوسرے سے شادی کرنا چاہتے ہیں لیکن صداقت کے گھر والے راضی نہیں ہے اور اسے بھاگ جانے پر راضی کرتا ہے جب نائلہ اسے کہتی ہے کہ تمھارے گھر والے ہی راضی نہیں تو ہم کہاں رہیں گے تو صداقت اس سے یہ کہتا ہے:

''شادی کے بعد اکثر لوگ والدین سے الگ رہتے ہیں ہم بھی اپنا الگ سے گھر بنائیں گے جہاں ہم اپنی نئی زندگی کی شروعات کریں گے سب ٹھیک ہو جائے گا۔''[۱۳]

اس افسانے میں صداقت کا کردار ایک اچھا کردار نہیں ہے جو پہلے اپنی محبت کو گھر سے بھگا کر لے جاتا ہے اور پھر بیٹیوں کے پیدا ہونے کی وجہ سے خدا کے حکم میں دخل اندازی، نہ شکری اور ناراضگی کا اظہار کرتا ہے اور اپنی بیوی کو بُرا بھلا کہتا اور اُسے جائز مقام نہیں دیتا۔ ساجد خان نے اس افسانے کے ذریعے حقیقت دکھانے کی کوشش کی ہے اور معاشرتی برائی کو سامنے لایا ہے ان کا ہر افسانہ ایک نرالے موضوع پر ہوتا ہے جس سے ان کے افسانوں میں کہیں بھی بوریت نہیں پائی جاتی موضوعات کا نیا پن اور کرداروں کی تخلیق انہیں نئی جہت عطا کرنے کے ساتھ بے مزہ نہیں ہونے دیتی۔ افسانہ ''نئی کہانی'' میں مصنف نے اس کردار کی طرف اشارہ کیا ہے جو معاشرے کی بھرپور عکاسی کرتا ہے جس میں ایک عورت کے کردار کو پیش کیا ہے جو اپنے جسم کا کچھ حصہ ننگا کر کے بھیک مانگتی ہے اور اس کی عریانی کشش کی وجہ سے لوگ بھی کچھ نہ کچھ دے جاتے ہیں مصنف نے اس کے ذریعے معاشرے کو دیکھتے ہوئے عریانیت کے پہلو کو بھی اور بے رہروی کے پہلو کو بھی اُجاگر کیا ہے اور دوسری طرف مختلف چھوٹی چھوٹی کہانیوں کی مدد سے سماج اور سیاسی لیڈروں کا ذکر کیا ہے جو جھوٹ فریب کی سیاست کرتے ہیں ہر طرف دھوکا دہی ہے اِنہی موضوعات پر ساجد خان نے اپنے اس افسانے کو چھوٹے چھوٹے پلاٹ کے ساتھ ترتیب دیا ہے اور اس میں ایک نفسیاتی کشمکش پیدا کی ہے اور اپنے کرداروں کی نفسیات سے آگاہی کا ثبوت دیتا ہے اور قاری کو عجیب سی کشمکش اور الجھاؤ میں ڈالتا ہے کیوں کہ کہانی اور کردار اور اس کے ساتھ ماحول اور واقعات قاری پر اپنا ایک مجموعی اثر چھوڑتے ہیں۔ پروفیسر سیّد وقار عظیم نے ایسے

افسانوں کے متعلق لکھا ہے:

> ''کردار نگاری کا یہ نفسیاتی طریقہ اب ناولوں اور افسانوں میں بہت عام ہوتا جا رہا ہے اور اس طریقے نے افسانہ نگاری کے فن میں زبردست تبدیلیاں کی ہیں۔افسانہ نگاروں کو اب انسانی ذہن کے مطالعہ میں نظر کی گہرائی اور فکر کی صفائی سے کام لینا پڑتا ہے اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوں تو ''شعور کی رو'' سے افسانہ کی رفتار اور اس کی ترتیب میں جو ظاہری بے ربطی پیدا ہو جاتی ہے وہ پڑھنے والوں کے ذہن کو ایسے الجھاوے میں مبتلا کر دے کہ اس کے لیے کردار کے متعلق کسی صحیح نتیجے پر پہنچنا غیر ممکن ہو جائے۔نظر کی گہرائی اور فکر کی صحت اس بے ربطی میں بھی ایک خاص قسم کا فنی ربط اور تسلسل پیدا کرتی ہے۔ اور مجموعی طور پر یہ بغیر پلاٹ یا متعدد چھوٹے چھوٹے پلاٹوں سے بنا ہوا افسانہ ایک مجموعی تاثیر چھوڑتا ہے۔''[۱۴]

افسانہ ''وی'' بھی ہمارے معاشرے ہی کی کہانی ہے اس افسانے کا مرکزی کردار یاسر صدیقی ہے جو سیاست کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے ساجد خان نے اس افسانے کے ذریعے ایک ایسا رویہ سامنے لایا ہے جو سیاسی لیڈر نوجوانوں کے ساتھ روا رکھتے ہیں انہیں دولت اور شہرت کا لالچ دے کر اپنا مفاد پورا کرتے ہیں۔مصنف نے اس کہانی کو فنی طور پر بڑی مہارت سے تخلیق کیا ہے۔اسی طرح افسانہ ''غلاظت'' میں بھی ساجد خان نے ایک طرف معاشرے کی غربت اور ناداری کے ساتھ ملک میں بے روزگاری کے سبب نوجوان خودکشی کر لیتے ہیں اور دوسری طرف معاشرے کی بے رہروی کا ذکر ہے، جس میں ایک عورت نے دوسرے شخص کے ساتھ ناجائز تعلقات استوار کر رکھے ہیں جو غلاظت اور گندگی کی زندگی میں چلے جاتے ہیں اس افسانے میں عورت کا کردار معاشرے کا ہی کردار ہے مصنف نے اس کہانی کے ذریعے معاشرے میں ہونے والی برائی کو سامنے لایا ہے۔اس افسانے میں عریانیت کا پہلو نمایاں ہے لیکن مصنف اسے اہم موڑ دے کر بڑی فنکاری سے عریانیت کی کیفیت سے بچاتے بھی ہیں۔ڈاکٹر کاشف بٹ ان کی کردار نگاری پر یوں رقمطراز ہیں:

> ''ساجد خان وہ کہانی کار ہے جو کائنات کی کوک سے کہانی کشید کرتا ہے۔وہ مرتی ہوئی انسانیت کو اپنی کہانی میں ایک نئے جنم کی بشارت دیتا ہے اور یہی فن اُسے تخلیق کار کے منصب پر فائز کرتا ہے۔ساجد خان جو کردار تخلیق کرتا ہے ان میں اپنے تخیل سے ایسے

> رنگ بھرتا ہے جو کبھی پھیکے نہیں پڑتے ۔ وہ معاشرے کے ننگے کرداروں کو اس فنکاری سے لبادے اوڑھاتا ہے کہ کہانی کو عریانیت سے بھی صاف بچا لیتا ہے اور کرداروں کے عوامل کی کارفرمائی بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔''۱۵؎

ساجد خان نے اپنی کہانیوں میں واقعات اور کردار کے ذریعے حقیقت سامنے لائی ہے ان کی کہانیوں میں اچھے کردار بھی ہیں اور بُرے کردار بھی ہیں انھوں نے گہرے مشاہدے سے ان کو تخلیق کیا ان کے موضوعات ہی ایسے ہیں ، جو معاشرے اور سماج سے تعلق رکھتے ہیں انھوں نے ان کے ذریعے زندگی کے مختلف مراحل کو سامنے لایا ہے حقیقت میں یہ ان کی فنی خوبی ہے کہ انھوں نے جو موضوعات لیے چاہے وہ معاشی ہوں یا معاشرتی ان مسائل کو اُجاگر کر کے ان کا حل بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے ایک فرد کی نفسیات کے مطابق اپنی کہانی کو تخلیق کیا ہے جو قاری پر اپنا اثر چھوڑ کر کچھ نہ کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہے ، جس سے وہ خود بھی کوئی نہ کوئی نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے بارے میں محمد منشا یاد لکھتے ہیں:

> ''ساجد خان نے افسانوں میں ادب کو کہیں بھی پامال نہیں ہونے دیا ساجد خان کا موضوع ہماری معاشرتی زندگی سے اُبھرتے ہوئے اور سلگتے ہوئے معاشی و معاشرتی مسائل کا حسنِ ادراک ہے۔ ان افسانوں میں انھوں نے اپنے تجربے، مشاہدے اور عمیق مطالعے کی روشنی میں جیتے جاگتے کرداروں کو زندگی کے مختلف رنگوں کی صورت میں اُجاگر کیا ہے۔ بعض مراحل پر وہ اپنے قاری سے روبرو مخاطب ہیں تو بعض واقعات و حادثات کو بلا تبصرہ اور بلا واسطہ جیسا دیکھا ویسا ہی پیش کر دیا ہے۔''۱۶؎

گوان کی کہانیوں کے کردار اور موضوعات اِسی ماحول سے تعلق رکھتے ہیں انھوں نے اپنے آس پاس سے ہی موضوعات ، واقعات اور کرداروں کو لے کر اپنی کہانی تخلیق کی۔

مکالمہ نگاری:

کوئی بھی تخلیق کار اپنی کہانی کو آگے بڑھانے کے لیے مکالمہ نویسی کا کام کرتے ہیں مکالمہ دو آدمیوں کے درمیان ہوتا ہے جو کہانی کو اختتام تک پہنچانے کے لیے مدد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی یوں رقمطراز

ہیں:

''دو یا دو سے زیادہ اشخاص کی گفتگو کو انہی کے الفاظ میں نقل کرنا ادبیات کی اصطلاح میں مکالمہ کہلاتا ہے۔ سقراط مکالمے ہی کے ذریعے سے تعلیم دیتا تھا۔ افلاطون نے بھی فلسفیانہ فکر واستدلال کے لیے مکالمے کا طریق استعمال کیا ہے۔''[۱۷]

مکالمے کا فن زیادہ تر ڈرامے میں استعمال ہوتا ہے لیکن دیگر اصناف میں بھی اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔ مکالمہ سے دو آدمیوں کے کردار کے علاوہ ان کے جذبات بھی واضح ہوتے ہیں کہانی میں اچھے مکالمے سے ان کرداروں سے پہچان ہوتی ہے چونکہ مکالمے سے ہی ان کی نفسیاتی کیفیت کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ابو الاعجاز حفیظ صدیقی لکھتے ہیں:

''ڈرامے کے علاوہ داستان، افسانے، خاکے اور ناول میں بھی مکالمہ خاصی اہمیت رکھتا ہے چنانچہ افسانوی ادب میں مکالمہ نویسی کا بڑا درجہ ہے۔ سوانحی ادب میں بھی اس کی ضرورت پیش آتی ہے۔''[۱۸]

ساجد خان نے بھی اپنے افسانوں میں مکالمہ نویسی سے خوب کام لیا ہے اور انہی مکالمات سے کہانی کو اختتام تک پہنچایا ہے۔ افسانہ ''بے بسی، بے چارگی، درماندگی'' میں فلسفیانہ گفتگو کی گئی ہے جس میں بہت سے کردار آپس میں مکالمہ کرتے ہیں، جس سے اُن کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ افسانہ ''مکافاتِ عمل'' میں ملک وقار اور ایک عورت آپس میں گفتگو کرتے ہیں، جس میں عورت ملک وقار سے شادی کرنا چاہتی ہے اُسے اپنانا چاہتی ہے لیکن وہ اس سے دوری اختیار کرتا ہے۔ عورت اس سے کہتی ہے:

''کیا تم مجھے نہیں اپناؤ گے؟''[۱۹]

ملک وقار اس کو جواب دیتا ہے:

''نہیں! کبھی نہیں، کبھی بھی نہیں۔''[۲۰]

تو وہ عورت بڑی حیرانگی سے پوچھتی ہے۔ مگر کیوں؟ تو وہ اسے جواب دیتا ہے:

''اپنا تا انسان عورت کو ہے کیا تم اپنے آپ کو عورت سمجھتی ہو۔'' ۲۱

ان کی آپس میں گفتگو سے یہ پتہ چلتا ہے کہ عورت اس سے بے حد پیار کرتی ہے جب کہ ملک وقار اس کو ذلیل کرتا ہے اچھے طریقے سے بات نہیں کرتا مصنف نے ان کے مکالمہ سے کہانی میں دلچسپی کا عنصر چھوڑا ہے، جس کو پڑھ کر آدھے میں چھوڑا نہیں جا سکتا کیوں کہ اس میں تجسس ہے کہ آگے کیا ہوگا۔ افسانہ ''کل مونہی'' میں بھی مکالمہ کے ذریعے کہانی کا آغاز کیا گیا ہے۔ جس میں مصنف صداقت سے پوچھتا ہے:

''صداقت کیا بات ہے، خیریت تو ہے، آج کچھ خاموش خاموش سے ہو۔'' ۲۲

صداقت اس سے کہتا ہے کہ:

''اِس دنیا میں کوئی کسی کا نہیں۔'' ۲۳

آگے چل کر مزید گفتگو کی گئی ہے صداقت اس سے عورت کے بارے میں سوال کرتا ہے کہ تمھارا عورت کے متعلق کیا نظریہ ہے؟ تو وہ جواب دیتا ہے:

''عورت کے بارے میں مختلف نظریات ہیں۔ کوئی کائنات میں بکھرے رنگوں کا بنیادی جز و عورت کو سمجھتا ہے تو کوئی ان رنگوں میں فساد کی جڑ عورت کو کہتا ہے، کوئی اسے پھول کہتا ہے تو کوئی کانٹا، کوئی اسے پیکرِ حیا بتاتا ہے تو کوئی بے حیائی کا منبع قرار دیتا ہے، کوئی دل رُبا تو کوئی دل شکن۔ جس کو جس طرح کا تجربہ ہوا وہ اُسی انداز میں تعریف کرتا ہے۔'' ۲۴

صداقت اس کی بات کاٹتے ہوئے اپنے نظریات عورت کے متعلق بتاتا ہے کیوں کہ وہ جس لڑکی سے محبت

کرتا ہے اس کی شادی کہیں اور ہونی ہوتی ہے اور وہ اِسے گھر سے بھاگ جانے پر مجبور بھی کرتا ہے اس کیفیت میں وہ کچھ یوں گفتگو کرتا ہے۔جس سے اس کے جذبات سامنے آتے ہیں:

''عورت صرف مطلب پرستی کا دُھوکا دہی کا نام ہے جب تک اس پر منوں مٹی نہ پڑ جائے اِس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا بے وقوفی ہے۔''۲۵

اس افسانے میں مکالمے کے ذریعے کرداروں کی اصلیت سے واقفیت ہو جاتی ہے ان کی گفتگو سے ان کے نظریات سامنے آتے ہیں جو کہانی کے لیے دلچسپی کا باعث بنتے ہیں۔افسانہ ''نئی کہانی'' کا آغاز بھی مکالمہ کے ذریعے کیا گیا ہے جس میں ایک کہانی کار اور ایک شخص کے درمیان گفتگو کے ذریعے ملکی و معاشرتی حالات و واقعات اُجاگر کیے ہیں ان کی گفتگو سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہر طرف دھوکا دہی ،غربت ،افلاس ، بے روزگاری ،ظلم بربریت کا سماں ہے تو اس دور میں کہانی کیا لکھی جائے آج کل کے حالات و واقعات سے ہر کوئی واقف ہے اس بارے میں گفتگو کی گئی اور کہانی کو اختتام تک پہنچایا ہے جس سے ان کے کرداروں سے واقفیت آسانی سے ہو جاتی ہے ان کی گفتگو سے ایسا لگتا ہے جیسے کوئی حقیقت میں بات چیت کر رہا ہو یہی فن ہے انھوں نے اس کو بڑے احسن طریقے سے نبھایا ہے جس سے معاشرے میں رہنے والے لوگوں کو ذہنی کیفیت کا ادراک ہوتا ہے ان سے اچھے بُرے کا پتہ لگتا ہے انھوں نے مکالمہ نگاری سے ماحول، زندگی اور کرداروں کی بھرپور عکاسی کی ہے۔افسانوں میں مکالمہ نگاری کی اہمیت کے ضمن میں اجمل نذیر لکھتے ہیں:

''فلسفیانہ اندازِ گفتگو، الفاظ کا برجستہ استعمال، فہم و فراست میں ڈوب کر نہاں سے عیاں کی سمت عازمِ سفر ہونا، افسانے کے اندر ماحول کی بھرپور وضاحت اور اس ماحول کے عین مطابق اندازِ گفتگو کا برتاؤ، افسانے کے کرداروں میں حقیقی جان ڈال کر ایسے مکالموں کی ادائیگی جس سے نہ صرف ماحول کی عکاسی ممکن ہو بلکہ کرداروں کی بالغ نظری کو بھی ملحوظِ خاطر رکھا گیا ہے۔''۲۶

اجمل نذیر نے ان کے افسانوی مجموعے پر ان کے مکالمے پر بات کی ہے، جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے مکالمے کے ذریعے کرداروں میں جان ڈالی ہے اور ماحول کی بہترین عکاسی کی ہے دراصل مکالمہ اور ماحول

ہی سے اچھی کہانی تحریر کی جاسکتی ہے کیوں کہ قاری اس میں کھو جاتا ہے اور اس کہانی میں خود کو شامل کر لیتا ہے انھوں نے ماحول کو ذہن میں رکھتے ہوئے کرداروں کے ذریعے ان کے جذبات اور افعال کو سامنے لایا ہے۔ اچھا مکالمہ وہی ہوتا ہے جو اس مقصد کو مدِنظر رکھ کر لکھا جائے۔ اس ضمن میں ابوالاعجاز حفیظ صدیقی کچھ یوں رقمطراز ہیں:

> ''اچھا مکالمہ وہ ہے جو بولنے والے کی فطرت کی صحیح ترجمانی کرے۔ اختصار، برجستگی اور حسبِ ضرورت زبان کی ادبی سطح برقرار رکھنے کے باوجود کردار کی عمر، مزاج، عقائد و مقاصد اور احساسات و نظریات کا آئینہ دار ہو۔ جس میں صورت حال کا پورا احساس موجود ہو یعنی مکالمہ موقع محل کے مطابق ہو اور کہانی کو آگے بڑھائے۔''[۲۷]

ساجد خان نے اپنے افسانوں میں کرداروں کے ذریعے ایسی گفتگو کی ہے جس سے نہ صرف وہ اپنا مقصد بیان کرتے ہیں بل کہ ان کے جذبات کی تصویر بھی آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے انھوں نے گہرے مشاہدے سے ماحول اور کرداروں کو خاص سانچے میں ڈال کر تخلیق کیا ہے جو انھیں ایک ممتاز افسانہ نگار بناتے ہیں وہ ماحول اور گفتگو کے ذریعے افسانوں میں رنگ بھرتے ہیں جو پڑھنے والوں کے لیے شادمانیوں یا دُکھوں کا اظہار ہوتا ہے۔

منظر نگاری:

ساجد خان نے اپنے افسانوں میں الفاظ کے ذریعے کمال کی منظر کشی کی ہے۔ ان کے افسانے ''مکافاتِ عمل''میں زلزلے کے وقت ہونے والی تباہی اور واقعات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ وہی سانحہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے یوں وہ حقیقت نگار کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ اس وقت کی صورتحال کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

> ''اسلام آباد سے مظفرآباد تک کوہالہ سے آگے تمام راستے بند تھے، بالاکوٹ ملیامیٹ ہو چکا تھا اور اس سے آگے مظفرآباد تک تمام سڑکیں لینڈ سلائیڈنگ کی وجہ سے مکمل طور پر بند ہو چکی تھیں۔ ملک بھر سے گاڑیاں منوں ٹنوں کے حساب سے سامان لیے مظفرآباد، بالاکوٹ اور گردونواح کے علاقوں کے لیے روانہ ہو چکیں تھیں، راولپنڈی سے آگے شدید ٹریفک جام تھا۔''[۲۸]

اس طرح واقعات نگاری کے ساتھ قاری کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ کہانی کے آخر تک جڑا رہتا ہے وہ اپنے تخیل سے تحریر میں خوبصورتی لاتے ہیں اِسی طرح افسانہ ''نئی کہانی'' میں ساجد خان نے ایسے ہی منظر کو پیش کیا ہے کہ وہ دیہات کے منظر کے ساتھ دیہاتی کھانوں کی نوع بہ نوع اقسام کی تصویر کشی کی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''اُس دن کھانے جیسا مزا آج تک نہیں آیا۔ کھایا بھی تو خوب تھا مکئی کی تازہ روٹیاں، سرسوں کے ساگ کے ساتھ سونچل کا ساگ، گڑنچی میں لسی، پودینے کے ساتھ کچھ تمبر کا چھڑکاؤ، چار ہری مرچیں، ٹماٹر اور لہسن کو مکس کر کے بنائی گئی چٹنی، جس میں دہی کی آمیزش بھی تھی، مکھن کا پیڑا، مٹی کے فرش پر بچھایا گیا دسترخوان۔'' ۲۹

ساجد خان نے گاؤں کی خوبصورتی وہاں کے لوگوں کے طور طریقوں اور خوراک کے متعلق بڑی خوبصورتی سے گاؤں کی زندگی کو سامنے لایا ہے انھیں شہر سے زیادہ گاؤں کی آب وہوا پسند ہے جو کہ ان کے افسانوں میں جا بجا دیکھنے میں ملتی ہے انھوں نے اپنے افسانوں میں موسم کے تبدیل ہونے کا ذکر بھی کیا ہے۔ موسم سرما کی تصویر کشی کچھ اس طرح کرتے ہیں:

> ''گاؤں کی پہاڑی پر برف کی جمی موٹی تہہ، سرسر کرتی ہوا، پرندوں کا آپس میں دُبکنا، تیز بارش کا کبھی اُوپر تو کبھی نیچے چہل قدمی کرنا، درختوں کی ننگی ٹہنیوں کا خوشی سے جھوم جھوم کر نہانا، سامنے والے نالے کا شور مچانا، ندی کا آپے سے باہر ہو کر چھلانگیں لگانا، لکڑیوں کا تڑ تڑ کر کے جلنا، انگاروں کا اُچھل اُچھل کر اِدھر اُدھر بھاگنا، آگ کے گرد دائرے میں بیٹھے مرد عورتیں بوڑھے بچے، کبھی اپنے پاؤں تو کبھی اپنے ہاتھوں کو گرم کیے جا رہے تھے۔ بارش میں بھیگ جانے والی بکریاں کونے میں معصومیت سے آنکھیں جھپک رہی تھیں۔'' ۳۰

ساجد خان کو منظر نگاری میں بھی ملکہ حاصل ہے کیونکہ ساجد خان گاؤں میں کئی کئی مہینے بسر کرتا رہا اس سلسلے میں اپنے ابائی گاؤں کیساتھ ساتھ اپنے ننہیال میں چھٹیاں گزارتا رہا افسانہ ''خلش'' میں بھی دیہاتی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے گاؤں کے صبح کا منظر بھی ہمارے سامنے لایا ہے، جس سے ایک لطف اور مزہ پیدا ہوتا ہے۔ ساجد خان اس کی منظر کشی یوں کرتے ہیں:

''روشنی پھیلنے کو مضطرب تھی ،نئی صبح کی صاف ستھری ،نہائی دھوئی ، پاک کرنیں آہستہ آہستہ ہر جانب خوشی سے گھومنا شروع ہو چکی تھیں، کئی گاؤں کے باسی نماز سے فارغ ہو کر کھیتوں میں چہل قدمی کر رہے تھے بعض اپنی بھینسوں کو چارہ ڈالنے لگے تو کئی بکریوں کو کھول کر پہاڑی کی جانب دھکیلنے میں مصروف تھے، کئی ڈھور ڈنگر اپنے کھونٹوں سے بندھے اب بھی اپنے مالک کی راہ دیکھ رہے تھے۔ پرندے اپنے اپنے گھونسلوں سے باہر آکر خوب شور مچا رہے تھے۔مرغیاں کوں کوں، کاں کاں، کُڑکُڑ کرتی اپنے پاؤں سے بھوسا، مٹی، سبزی کے پتے اِدھر اُدھر اڑا کر اپنے مقصد کی کچھ نہ کچھ شے پانے میں مصروف تھیں، جوں ہی وہ کچھ پا لیتیں چوزے چیں چیں کرتے اُن کی چونچ سے آن چونچ ملاتے ۔قدرے دُور جوہڑ میں کچھ بھینسیں نہا رہی تھیں اُسی جوہڑ میں مینڈک ٹرا ٹرا کرتے اُچھل کود میں مصروف تھے۔''۳۱

ساجد خان اس طرح کی منظر نگاری اپنے افسانوں میں اس لیے کرتے ہیں تا کہ قاری اس میں دلچسپی لے اور اس کو ادھورا نہ چھوڑے بلا شبہ اگر دیکھا جائے تو ان کے افسانوں میں دلنشین منظر کشی کی گئی ہے جس میں قاری کھو جاتا ہے اور ان کے افسانوں کو پڑھے بغیر نہیں رہ سکتے وہ ہر شے، واقعے اور تصویر کشی سے ایسی صورتیں اُجاگر کرتا ہے کہ قاری لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ساجد خان نے ایک دیہاتی منظر کی کمال مرقع کشی کی ہے۔لکھتے ہیں:

''گھروں میں مدھانیاں ، دہی کو لسّی اور مکھن میں بدلنے کے لیے گھم گھم گھم کی آواز سے ایک لے پیدا کر رہی تھیں ، جوان عورتیں گھروں کے کونوں میں بنے مٹی کے چولہوں میں چھوٹی بڑی ، سوکھی گیلی ،لکڑیاں ڈالے زور زور سے پھونکیں مار کر آگ لگانے میں مصروف تھیں ، بوڑھی عورتیں قدرے بلند آواز میں اللہ اللہ کر رہی تھیں ،درخت سرشاری سے کبھی ایک جانب کو تو کبھی دوسری جانب کو لہک رہے تھے۔''۳۲

اگر دیکھا جائے تو ساجد خان نے دیہاتی زندگی اور وہاں کے رہن سہن کا خصوصی مطالعہ کیا ہے اُن کا پس منظر بھی دیہاتی ہی ہے اور من وعن اپنے افسانوں میں پیش کر دیا ہے جو اس کے افسانوں کو نکھارتے ہیں دراصل یہ ان کا مشاہدہ اور تخیل ہے کہ ایسی منظر کشی کی جس سے دیہاتی زندگی عیاں ہوتی ہے کوئی بھی تخلیق کار اپنی تحریر کو مؤثر کرنے

کے لیے ہر قسم کے حربے استعمال کرتا ہے، جس سے اسکی تحریر میں دلکشی پیدا ہوتی ہے انھوں نے بھی ایسا ہی کیا، گاؤں کے رہن سہن طرزِ بود و باش اور طعام کو بڑے احسن طریقے سے اپنے افسانوں کا حصہ بنایا ہے اور ایسے مناظر دکھائے ہیں کہ پریم چند کی یاد تازہ ہو جاتی ہے ۔اُن کی منظر نگاری حقیقت نگاری کے دوش بدوش چلتی ہے ۔اس ضمن میں خاکسار نثار احمد لکھتے ہیں:

> ''ساجد خان کے افسانوں اور کہانیوں کو پڑھتے وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ اگر اس کہانی کو ہم نے ادھورا چھوڑ دیا تو بہت سے خوبصورت مناظر دیکھنے سے محروم رہ جائیں گے۔نامور افسانہ نگار جناب شعیب خالق ایک افسانے میں یوں پیرا گو ہیں کہ ''ارتعاش کی اپنی کوئی تصویر نہیں ہوتی بلکہ یہ جو کچھ اُگلتا ہے اس میں تصویریں ہوتی ہیں''۔اسی طرح میں یہ کہتا ہوں کہ تخلیق کی اپنی کوئی تحریر نہیں ہوتی بلکہ تخیل میں جو ابھرتا ہے اس میں تحریریں ہوتی ہیں۔'' ۳۳

انھوں نے اپنے افسانوں میں خوبصورت مناظر کی تصویر کشی کی ہے جو بھی منظر بیان کرتے ہیں وہ آنکھوں کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے اور افسانے کے حُسن کو دو بالا کرتا ہے۔

فطرت نگاری:

فطرت نگاری بھی ادبی طریقہ ہے جسے ابتدا میں فرانسیسی ادیب زولا نے ناول نگاری کے لیے استعمال کیا۔ قدرتی طور پر پیدا کی ہوئی کائنات ،قدرتی حالات ،اس کے علاوہ انسان کی فطرت اس کے احساسات ،جذبات، ادراک ،اس کی طبیعت، پیدائشی صفات وغیرہ فطرت کہلاتی ہے اس سلسلے میں پروفیسر انور جمال کچھ اس طرح لکھتے ہیں:

> ''فطرت بطور اصطلاح کئی علوم میں مستعمل ہے۔ادب میں یہ اصطلاح کئی معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔زمین وآسمان اور ان کے مابین جو بھی مظاہر،انسان کی ذات کے باہر جلوہ ریز ہیں وہ فطرت کہلاتے ہیں۔پھر خود انسانی ذات کے اندر ایک فطرت ہے یعنی اس کا وجدان ،جبلات، جذبات واحساسات ، ردِعمل اور ہیجانات کی شکل میں عِلاوہ ازیں مظاہرِ کائنات کی اشیا کی وہ خصوصیات بھی فطرت کہلاتی ہیں جن کی اپنی

''جبلت اور سرشت'' ہے۔''۳۴

گویا زمین و آسمان کے مظاہر کے علاوہ انسانی جذبات و احساسات یعنی خوشی غمی بھی فطرت کے زمرے میں آتے ہیں۔ کیوں کہ کائنات میں ہر ایک کی اپنی فطرت، خلقت، عادت، اسکی پیدائشی صفات و خصوصیات ہوتی ہیں جو اُسے قدرت کی طرف سے ملتی ہے وہ اس کی فطرت کہلاتی ہے۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی اس سلسلے میں رقمطراز ہیں:

''ادب اور فن کی دنیا میں لفظ فطرت چار مختلف مضمونوں میں استعمال ہوتا ہے۔
(الف) صحیفہ فطرت: خارجی کائنات جو فنکار کی ذات سے باہر اپنے پورے جلال و جمال سمیت موجود ہے۔
(ب) قوانین فطرت: جنھیں دریافت کرنا، تسخیر کائنات اور ارتقائے انسان کے لیے لازم ہے۔
(ج) ہر چیز کی مخصوص افتادِ طبع جو کسی شے کی طبعی خصوصیات سے عبارت ہے۔
(د) انسانی سرشت: انسانی جبلتوں، ہیجانات اور جذبات کا نام۔''۳۵

فطرت نگاری میں انسان کے فکر و خیال اس کے احساسات و جذبات کا آزادانہ اظہار فطرت نگاری ہے اس میں ہر طرح کے موضوعات کا ادب میں کھل کر اظہارِ خیال کرنا کہ جیسی فطرت ہے اس کو بالکل ویسے ہی پیش کرنا فطرت ہے نہ کے اس کو حقیقت کے برعکس پیش کرنا فطرت نگاری ہے غرض جنسی موضوعات کو بھی استعمال کرنا یعنی اس کو مکمل آزادی ہونی چاہیے۔ ادب میں کسی بھی پہلو پر انسانی سرشت کو بیان کرے۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی لکھتے ہیں:

''سائنس دان کی سی کامل معروضیت، اہم اور غیر اہم جزئیات و تفصیلات کا ہجوم، جنس کے بیان میں جزئیات نگاری کے ادیبانہ استحقاق کا ناجائز استعمال، مواد اور موضوع کے انتخاب میں کامل آزادی، ہر قسم کے مواد کو ادب کا موضوع بنانے پر اصرار، ادب میں تہذیبی مشن سے آزاد آدم فطری کی پیشکش یعنی آدم فطری کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کا دعویٰ فطرت نگاری کی نمایاں خصوصیات ہیں۔''۳۶

گویا فطرت نگاری میں تخلیق کار کو یہ آزادی حاصل ہے کہ ہر موضوعات کو ادب کا حصہ بنا سکتے ہیں۔ فطرت نگاری ساجد خان کے افسانوں میں بھی ملتی ہے انھوں نے اپنے افسانوں میں مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی اور

فطرت کی عکاسی کی ہے۔ان کے افسانوں میں معاشرے میں رہنے والے انسانوں کے جذبات وخیالات کو ان کی فطرت کو افسانوں میں شامل کر کے ان کے افکار سے آگاہ کیا ہے۔انھوں نے اپنے گردوپیش کی حقیقی تصویریں کھینچی ہیں فطرت نگاری کا اصل مقصد جزئیات نگاری تھا انھوں نے جزئیات نگاری کے ذریعے افسانوں میں لوگوں کے جذبات کے پس منظر میں کائنات کا بھی ذکر کیا ہے۔انھوں نے اپنے افسانوں کے موضوعات اردگرد سے لیے ہیں جو اس معاشرے کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔وہ مناظر قدرت کو بھی افسانوں میں شامل کرتے ہیں جیسے افسانہ ''کل موہی'' میں محبت کے جذبات دکھائی دیتے ہیں جس میں صداقت اُسے بھاگ کر شادی کرنے پر آمادہ کرتا ہے لیکن نائلہ کا ذہن فطری طور پر نا پختہ ہے وہ اپنے والدین، گھر بار اور عزیز واقارب کو چھوڑ کر صداقت کے ساتھ بھاگ کر شادی کر لیتی ہے اس افسانے میں عورت کے جذبات بھی سامنے آتے ہیں کہ وہ صرف محبت کی خاطر گھر بار چھوڑ کر بھاگ جاتی ہے مصنف نے افسانے میں معاشرے کی ہی کہانی بیان کی ہے۔اسی طرح افسانہ ''نئی کہانی'' میں فطرت کی عکاسی کی گئی ہے جس میں قدرتی مناظر دکھائے گئے ہیں جو دل ودماغ کو مسرت بخشتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

> ''سامنے لہلہاتے کھیت، تاحدنظر پھیلا سبزہ ہی سبزہ، برہنہ پاؤں جب سبزے پر چند قدم ہی چلے تو ٹھنڈک پاؤں سے دماغ تک سرایت کر گئی۔مٹی کی مہک کا نعم البدل کوئی نہیں، شبنم کے قطرے سبزے اور پھولوں سے اپنی لازوال محبت کا دَم بھرتے آخری سانسیں لے رہے تھے۔پرندوں کی آوازوں میں ردھم اور ٹھہراؤ تھا۔شاید وہ باری باری ایک دوسرے کو پکارتے تھے، پہلے ایک بولتا تو سب اس کی سنتے پھر وہ خاموش ہو جاتا تو دوسرے اسے کہیں دُور سے جواب دیتے، کچے مکان، بھوسے کی اُڑتی دھول، چشمے کا ٹھنڈا پانی، سامنے جوان لڑکیاں سروں پر پانی کے گھڑے اُٹھائے اپنی سہیلیوں سے باتیں کرتی ہوئی اپنے اپنے گھروں کو جارہی تھیں۔''۳۷

ساجد خان نے ایسی فوٹو گرافی کی ہے کہ سب کچھ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔مناظر کا عکس قدرتی مناظر کی تصویر کشی کے ساتھ ہی جنسی موضوع پر بھی اپنے افسانوں میں بات کرتے ہیں مرد اور عورت کے اُبھرتے جذبات ان کی نفسیاتی کیفیت کو سامنے لاتے ہیں اس طرح افسانہ ''غلاظت'' میں ایک شخص کی ذہنی کیفیت کی تصویر پیش کرتے ہیں جو کسی بے چینی کے سبب خود سے باتیں کر رہا ہے اور اس کو سکون میسر نہیں ہو پا رہا۔وہ لکھتے ہیں:

> ''آخر کب تک اَن دِیکھے خوف سے میں خود کو اس طرح پامال کرتا رہوں گا، مجھے کوئی

سبیل نکالنی چاہیے۔ جو چند لمحوں کا ہی سہی پر سکون تو دے یہ میری خواہش جو میرے اصل سے ہے معاشرے کی فرسودہ، گھسی پٹی روایات نے نقل بنا کر تلچھٹ میں بدل دی ہے۔ کیا اپنی روح کو میں خود داغ دار کر رہا ہوں یا معاشرے کی وہ تقسیم اِسے زچ پہنچا رہی ہے جو انھوں نے لبادے کے طور پر اوڑھ رکھی ہے۔ کب تک معاشرے کے رحم و کرم پر سسک سسک کر زندگی گزارتا رہوں گا۔ کب تک دھند میں سفر کیا جا سکتا ہے جب کہ منزل کا کچھ پتہ ہی نہ ہو اور اگلے دو قدموں پر بھی کچھ دکھائی نہ دیتا ہو۔ پہلے ایک دُھند میں تھا پھر دوسری میں اب تیسری میں آ پہنچا پھر اس کی پاداش میں چوتھی میں دھکیل دیا جاؤں گا۔''۳۸

ساجد خان نے حالات و واقعات اور فطرت کا گہرا مشاہدہ کیا ہے۔ کچھ تخلیق کاروں کے نزدیک فطرت نگاری ایک ایسا عمل دنیا میں جو مواد موجود ہے اس کو ادب کا موضوع بناتے ہیں وہ جنسی، معاشی، سماجی غرض کچھ بھی ہو اس میں موجود حقائق پیش کرتے ہیں لیکن ممتاز حسین ان حقائق کو فطرت نگاری تسلیم نہیں کرتے اس ضمن میں وہ یوں رقمطراز ہیں:

''سچ تو یہ ہے کہ نیچرلزم حقیقت نگاری نہیں بلکہ حقیقت کے کسی ایک جز کو پیش کرنے کی تکنیک ہے۔ یوں تو اس تحریک کا تعلق گندی گلیوں کے رہنے والوں کی زندگی سے ضرور رہا ہے لیکن مقصد صرف جزئیات نگاری تھا۔ اگر ہم ادیب کے انتخاب موضوع کے پیچھے چھپی ہوئی ہمدردی نظر انداز کر دیں تو یہ ماننا پڑے گا کہ نیچرلزم فوٹو گرافی کا آرٹ ہے یا اصل سے مشابہت پیدا کرنے کا نظریہ تھا اور اسی وجہ سے وہ اپنے موضوع کو سماجی زندگی کے تمام رشتوں سے منقطع کر کے پیش کرتے تھے۔''۳۹

وحدتِ تاثر:

افسانہ کے لیے وحدتِ تاثر سب سے اہم خوبی ہے، جس میں صرف ایک ہی مقصد پر زور دیا جاتا ہے اور بے جا طوالت سے گریز کیا جاتا ہے اگر ایک معیاری افسانے میں ایک سے زیادہ مقاصد ہوں تو وہ عمدہ افسانہ قرار نہیں پائے گا اور ایسا افسانہ قاری کے لیے نہایت پھیکا، بے رس اور غیر دلچسپ بن جاتا ہے کیوں کہ افسانہ کسی ایک واقعہ، ایک مقصد کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ قاری کے ذہن پر ایک دلچسپ اور مثبت اثر چھوڑتا ہے اس ضمن میں انور جمال یوں لکھتے ہیں:

> ''افسانہ زندگی کے کسی ایک واقعے یا ایک پہلو کی وہ خلاقانہ اور فنی پیش کش ہے، جو عموماً کہانی کی شکل میں پیش کی جاتی ہے ایسی تحریر جس میں اختصار اور ایجاز بنیادی حیثیت رکھتے ہیں وحدتِ تاثر Unity of Impression اس کی سب سے اہم خصوصیت ہے۔''[۴۰]

افسانے میں وحدتِ تاثر بہت ضروری ہے کوئی بھی تخلیق کار اپنے افسانے میں کسی واقعہ کو ایسے پیش کرتا ہے کہ وہ ایک تاثر چھوڑے۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی لکھتے ہیں:

> ''ادب کی دنیا میں وحدت کے معنی ہیں کسی ادب پارے کے مختلف اجزا کا اپنی ترکیبی حیثیت میں باہم اس طرح مربوط، متحد اور منظم ہونا کہ مجموعی طور پر وہ ایک اکائی تاثر دے سکے۔''[۴۱]

کوئی بھی افسانہ نگار اپنی کہانی میں کوئی ایک پہلو سامنے لاتا ہے چاہے وہ نفسیاتی، سیاسی، معاشی، معاشرتی وغیرہ غرض ایک تاثر چھوڑتا ہے کیوں کہ وحدتِ تاثر میں کسی ایک مقصد پر زور دیا جاتا ہے اگر وہ ایک سے زیادہ مقصد پر زور دے گا تو اس میں فنی خرابیاں پیدا ہو جائیں گی اگر وہ افسانے میں ایک سے زیادہ مقصد کو لے کر جائے گا تو اپنی توجہ باقی چیزوں پر بھی مرکوز کرنی پڑے گی۔ جس کی وجہ سے مصنف کا اصل پہلو رہ جاتا ہے اور قاری بھی اس میں دلچسپی نہیں لیتا اس لیے وحدتِ تاثر افسانے میں لازمی شے ہے، جو اس کو بے جا طوالت سے بھی بچاتی ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر سیّد وقار عظیم وحدتِ تاثر کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''افسانے میں اتحاد اثر پیدا کرنے کے لیے افسانہ نگار کو، جس چیز کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دینی چاہیے وہ یہ ہے کہ افسانہ میں وہ ہمیشہ صرف ایک مقصد پر زور دے۔ ایک افسانہ میں ایک سے زیادہ مقاصد کی طرف متوجہ ہو جانے سے بہت سی فنی خرابیاں پیدا ہو جاتیں ہیں اور دوسری طرف سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ افسانہ نگار کو اپنی توجہ ایک چیز کے بجائے مختلف چیزوں کی طرف کرنی پڑتی ہے اور ہر پہلو کو نمایاں بنانے کی کوشش میں اس کا سب سے زیادہ اس کا اہم پہلو تاریکی میں پڑ ہو جاتا

ہے۔اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پڑھنے والا بھی افسانے کے مقصد میں یکسوئی کے
ساتھ دلچسپی نہیں لے سکتا۔''۴۲؎

ساجد خان کے افسانوں میں وحدتِ تاثر کا وصف پایا جاتا ہے وہ بھی ایک ہی مقصد پر زور دیتے دکھائی دیتے ہیں، جس سے وہ اپنا مقصد اور اپنی بات بڑے احسن طریقے سے قاری تک پہنچانے میں کامیاب رہتے ہیں۔ وہ افسانوں میں غیر ضروری تفصیل سے کام نہیں لیتے بل کہ نہایت اختصار سے افسانے تخلیق کیے ہیں۔کوئی بھی تخلیق کار اگر کوئی فن پارہ تحریر کرتا ہے تو وہ ایک ہی تاثر شروع سے آخر تک ساتھ لے کر جائے گا تو اس میں دلچسپی قائم رہے گی اگر مصنف اپنے فن پارے میں اس اصول کو نہیں اپنائے گا تو فنی خرابی کا باعث بنے گا جس سے قاری کی توجہ ہٹ کر رہ جائے گی اور وحدتِ تاثر قائم نہیں رہے گا اور وہ اکتاہٹ محسوس کرے گا۔اس حوالے سے ابوالاعجاز حفیظ صدیقی لکھتے ہیں:

''وحدتِ تاثر اکثر اصناف میں اہمیت رکھتی ہے لیکن مختصر افسانے اور ایکانکی ڈرامے میں
وحدتِ تاثر کو ایک شرط لازم کی حیثیت حاصل ہے وحدتِ تاثر سے مُراد یہ ہے کہ ادب
پارہ قاری یا ناظر کے ذہن پر ایک اور صرف ایک تاثر چھوڑے کیوں کہ اگر تاثر کئی
سمتوں میں بٹ جائے گا تو اس کی شدت اور گہرائی میں کمی واقع ہو جائے گی۔''۴۳؎

ساجد خان کے افسانوں میں سے ہر افسانہ کسی نہ کسی مقصد کی تکمیل کرتا ہے۔اسی طرح تخلیق کار اپنے نظریے اور مقاصد کے پیشِ نظر لکھتا ہے غرض وہ مقاصد کچھ بھی ہو سکتے ہیں شرط یہ ہے کہ جو بھی فن پارہ تخلیق کیا جائے اس میں وحدتِ تاثر ہونا لازمی ہے اگر بلا وجہ طوالت سے کام لیا جائے گا تو اس میں وہ تاثر نہیں رہے گا کیوں کہ مصنف جو مقصد بیان کرنا چاہ رہا ہے اس کے علاوہ اور بھی مقاصد بیان کر رہا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قاری اس کو صحیح تناظر سے سمجھ نہیں پاتا۔ بقول پروفیسر سیّد وقار عظیم:

''افسانے مختلف مقاصد سے لکھے جاتے ہیں۔کسی میں ایک مخصوص شخص کے مثالی
کردار کو پیش کرنا ہوتا ہے، کسی میں ایک شخص کی صرف ایک صفت کو نمایاں کرنا منظور
ہے، کہیں کسی سماجی خرابی کی اصلاح مدِ نظر ہے، کسی جگہ لوگوں کو کسی سیاسی فرض کے
انجام دینے کی طرف آمادہ کرنا ہو یا ان مقاصد کے علاوہ کسی افسانے کے ذریعے سے

> محض انسان میں فنون لطیفہ کے اثرات کا احساس پیدا کرنا ہے،کسی موقع پر سوئے ہوئے جمالیاتی حس یااس کےعلاوہ کسی اورتعمیری جذبہ کی بیداری مقصود ہوغرض افسانہ لکھنے کے لیے ایک نہیں ہزاروں محرکات ہو سکتے ہیں لیکن اس مقصد کے ساتھ دوسرا مقصد بھی ملا لیا جائے گا تو افسانہ نگار خواہ دونوں کی دلچسپیوں میں فرق پڑ جانے کے علاوہ ان کے سامنے طرح طرح کی دِقتیں پیش ہوں گی۔''۴۴؎

ان دقتوں کو دور کرنے کے لیے ہر چیز میں تفصیل سے کام نہیں لینا دقتیں کیوں پیدا ہوتی ہیں؟ کیوں کہ تخلیق کار ہر وہ چیز لکھتے چلے جاتے ہیں جو ان کی نظر سے گزر رہی ہوں اس کا تعلق افسانے سے ہو یا نہ ہو،جس سے افسانے کی خوبی پر بُرا اثر پڑتا ہےاور جونئی خوبی پیدا ہو رہی ہے وہ بھی اور دوسری خوبیاں بھی ختم ہو جاتیں ہیں اور یہ خرابی قاری کو اپنے ساتھ جوڑے نہیں رکھتی،جس وجہ سے وہ اصل مقصد کی طرف متوجہ نہیں ہو پاتا۔اس لیے اس بات کو ضروری سمجھا جائے کہ غیر ضروری طوالت سے پرہیز کیا جائے اور اس چیز کو اپنایا جائے جو کسی بھی مقصد کے لیے اپنا ایک تاثر رکھتی ہو۔

زبان وبیان:

ساجد خان کی زبان و بیان کی بات کی جائے تو انھوں نے بالکل سادہ اور سلیس زبان کا استعمال کیا ہے۔ان کے افسانوں کو ان کے اسلوب نے ہی جلا بخشی ہے۔اسلوب کیوں کہ کسی بھی شاعر یا ادیب کا لکھنے کا طریقہ یا اس کا طرز نگارش ہوتا ہے، جو اس کو اِسی صنف میں لکھاریوں سے منفرد کرتا ہے کیوں کہ وہ اپنے فن سے اس انداز سے اس کو تحریر کرتا ہے جس سے اس کی الگ شناخت بنتی ہے وہ اپنے جذبات کو،اپنے تخیل کو بیان کرتا ہے۔ابوالاعجاز حفیظ صدیقی اسلوب کے بارے میں کچھ اس طرح رقمطراز ہیں:

> ''اُسلوب سے مراد کسی ادیب یا شاعر کا وہ طریقہ،ادائے مطلب یا خیالات وجذبات کے اظہار و بیان کا وہ ڈھنگ ہے، جو اس خاص صنف کی ادبی روایت میں مصنف کی اپنی انفرادیت (انفرادی خصوصیات) کے شمول سے وجود میں آتا ہےاور چونکہ مصنف کی انفرادیت کی تشکیل میں اس کا علم،کردار،تجربہ، مشاہدہ،افتادِ طبع،فلسفۂ حیات اور طرزِ فکر و احساس جیسے عوامل حصہ لیتے ہیں۔اس لیے اُسلوب کو صنف شخصیت کا پرتو اور اُس کی ذات کی کلید سمجھا جاتا ہے۔''۴۵؎

اُسلوب بنیادی طور پر کسی کی تحریر اور انداز نگارش ہوتا ہے، جو اس کے خیالات اور جذبات کی ترجمانی کرتا ہے اور اس کو ایک نیا انداز مہیا کرتا ہے۔ ساجد خان کا انداز بھی سادہ اور دلکش ہے، جس کی وجہ سے ان کے افسانوں میں ایک نوع کی جاذبیت پیدا ہوتی ہے ایک تو ان کی زبان سادہ ہے اور آسانی کے ساتھ ان کے افسانوں کو پڑھ کر اس سے نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے ان کی تحریر میں سلاست کا عنصر غالب ہے۔ اس ضمن میں عادل سعید قریشی ان کے اسلوب کے بارے میں رکھتے ہیں:

''ساجد خان کے ہاں سلاست صفتِ خاص کے طور پر سامنے آتی ہے۔ زبان کی یہ سلاست ان کے ہاں تازگی اور شگفتگی کو جنم دیتی ہے۔ یہی خوبی روانی اور ترسیل معنی کو یقینی بناتی ہے فکشن میں ایسی خوبی ادب پارے کی چاشنی اور دلکشی کا سبب بھی بنتی ہے۔''۴۶

ساجد خان کے اُسلوب اور طرزِ نگارش میں ایک طلسم ہے جو قاری کو اپنے سحر میں گرفتار کر لیتا ہے ان کے اُسلوب میں شائستگی اور شگفتگی کے عناصر موجود ہیں بنیادی طور پر یہ زبان کی خوبی سے واقف ہیں وہ سمجھ بوجھ سے اپنا مقصد اس طرح بیان کرتے ہیں کہ قاری اس کا اثر قبول کرتا ہے۔ اور ایسے جملے اپنے افسانوں میں لائے ہیں جو سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں اور عمدہ اُسلوب کے ذریعے حقیقت کو سامنے لایا ہے یہ ساجد خان کا کمال ہے کہ وہ کہانی میں کوئی نہ کوئی ایسی بات کر جاتے ہیں جو اپنی ایک الگ حیثیت رکھتی ہے دراصل یہ ان کا فن ہے انھوں نے گرد و پیش رونما ہونے والے مسائل اور عوام کے رویوں کا نفسیاتی مطالعہ کیا نیز اپنے جذبات کی آمیزش سے کہانی کی بہترین صورت پیش کرتے ہیں۔ محمد بشیر رانجھا لکھتے ہیں:

''ساجد خان کے افسانوں اور کہانیوں کا نفسیاتی اور حسی تجزیہ کرتے ہوئے اُس کے اُسلوب کی برجستگی اور بے تکلفی کی داد نہ دینا بھی ناانصافی ہوگی۔ اُس کی توجہ نہ تو صناعی کی جانب ہے اور نہ ہی اُسلوب کے بناؤ سنوار کی جانب، لفظوں کی نشست و برخاست کا ریاضت طلب معاملہ اُس کے لیے اہم نہیں، وہ خیال اور جذبے کے بہاؤ میں بہتا ہے اور ہر نوع کے الفاظ میں اپنے مفاہیم کو منتقل کرتا چلا جاتا ہے۔ ہندکو، انگریزی، پنجابی اور دیگر زبانوں کے الفاظ اُردُو اُسلوب اور روائتی آہنگ میں استعمال کرنا اس کے لیے ممنوعہ نہیں ہے۔''۴۷

ساجد خان اپنے افسانوں میں بڑے خوبصورت جملوں کا استعمال کرتے ہیں اور غیر ضروری بحث سے اجتناب برتتے ہیں وہ بڑے ہی حسین پیرائے میں اپنی بات کہہ ڈالتے ہیں، جو اس کے تخیل اور جذبات کے ساتھ ساتھ اُن کی فہم و فراست کی گواہی پیش کرتی ہے۔ جیسے وہ افسانہ ''دائرے کا اسیر'' میں بیان کرتے ہیں:

''تم نے صرف ایک نقطے میں ساری زندگی گزار دی تھی، اس نقطے کو زندگی نے آج تمھیں دائرے میں ذلیل و رسوا کر دیا، وہ وقت جس کی پاداش میں آج تم ٹھوکریں کھا رہے ہو۔ صرف ایک ساعت تھی تم اس ساعت کے امتحان میں پیچھے رہ گئے ہو۔'' ۴۸؎

جب وہ وجہ پوچھتا ہے اس گھڑی کے امتحان میں پیچھے رہنے کی، جس کی وجہ سے آج اِدھر اُدھر ذلیل ہونا پڑ رہا ہے تو وہ اس سے کہتا ہے:

''تم نے اُس ساعت میں داغ دھونے تھے اور اُن داغوں کی جگہ روشنی نے لینی تھی۔ اچانک قوس قزح سے کہیں زیادہ دلکش رنگ ایک دوسرے میں ملتے ملاتے عجیب منظر پیش کرنے لگے، دھیرے دھیرے مختلف رنگ سفیدی میں بدلتے جا رہے تھے، تھوڑی ہی دیر میں ہر جانب سفیدی پھیل چکی تھی، میں جس طرف بھی دیکھتا آنکھیں چندھیا دینے والی سفید روشنی تھی، کبھی تو ایسے لگتا کہ ہر جانب آئینے ہیں جو روشنی کو منعکس کر رہے ہیں۔'' ۴۹؎

اس طرح کے جملے اور الفاظ ساجد خان کے افسانوں کی زینت بنے ہیں، جس سے ان کے جملے اور لفظ ذی شعور ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔ عادل سعید قریشی ان کے جملوں اور لفظوں کی گرفت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ساجد خان کے لفظ، جملے، تراکیب سازی اور خوبصورت تلازمے کے ساتھ تکرار حرفی و لفظی قاری کو اپنے افسانوں فصیح سے فصیح تر اور بلیغ سے بلیغ تر جملے لکھتا جاتا ہے۔ وہ نپے تلے انداز میں اپنا مدعا بیان کرتا جاتا ہے اور اپنی نثر کو حشو و زائد سے مامون رکھتا ہے۔ لفظ کو لفظ کے ساتھ یوں بٹھاتا ہے جیسے کوئی ماہر معمار ہو۔ ایک ایک جملہ اپنے معمار کی ذہانت، بلاغت، فہم اور ذی شعور ہونے کی گواہی دیتا ہے۔'' ۵۰؎

ساجد خان کے اُسلوب میں ایک اثر موجود ہے دراصل یہ ان کے الفاظ کا چناؤ ہے جو انھوں نے اپنے افسانوں میں شامل کیا ہے چونکہ یہی وہ چیز ہے جو افسانے کے حسن کو دوبالا کرتی ہے اور اس سے تحریر میں چاشنی پیدا ہوتی ہے جو پڑھنے والوں کو ایک خاص فضا اور ماحول مہیا کرتی ہے۔کوئی بھی فن کار جس طرح کے الفاظ اور جملوں کا چناؤ کرے گا اِسی قدر اس کے فن پارے میں تاثر بڑھے گا۔اس ضمن میں عادل سعید قریشی یوں رقمطراز ہیں:

''ساجد خان کے زبان کی ایک اور جو خوبی ملتی ہے وہ ان کا لفظیات کا متوازن اور برمحل چناؤ ہے۔غزل اور افسانہ اپنی لفظیات کی وجہ سے ہی تاثر پیدا کرتے ہیں کیوں کہ ان دونوں کا حسن ان کے ایجاز اور اختصار میں مضمر ہے۔افسانے میں چاشنی اور شیریں لفظ کی ایماندرانہ ڈھونڈ اور بلیغ استعمال کی رہین منت ہے،لفظ کی مناسب ترین چناؤ اور فصیح ترین برت تحریر کو اثر آفرینی کی دولت سے مالا مال کرتی ہے۔''۵۱

باقی اصناف موضوع زندگی ہے اِسی طرح افسانے کا بھی یہی موضوع ہے۔لکھاری زندگی کی خوشی غمی غرض ہر روپ کو سامنے لاتا ہے۔وہ اپنے گہرے مشاہدات کی بنا پر واقعات کے جذبات کو پیش کرتا ہے ان کی تحریروں اور افسانوں میں سنجیدگی پائی جاتی ہے اسکے علاوہ انھوں نے کہیں کہیں خطیبانہ انداز کو بھی اپنایا ہے،اپنے افسانے''زمین سکڑ رہی ہے''میں خطابت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں:

''تم اُندھے منہ نہ گرو۔سنو،پڑھو،سوچو،سمجھو،جائزہ لو،پرکھو،یقین تک جاؤ،تصورات کو واضح کرو۔فکر اور تدبر سے کام لو۔حقیقت کا پیچھا کرو۔دلیل مانگو۔خود جو بات کرو دلیل سے کرو۔بصیرت اور بصارت کو بروئے کار لاؤ۔جانو۔پہچانو،پھر ماننے میں لیت ولعل سے ہرگز کام نہ لو۔''۵۲

افسانہ''نئی کہانی''میں اندازِ خطابت ملاحظہ ہو:

''جہاں احساسات کو محسوس کرنے کی حس ختم ہو جائے،جہاں خیال کو سمجھنے والا کوئی نہ ہو ،جہاں خیال کی کوئی قدر نہ ہو۔وہاں خیال کو لفظوں کو پیرہن پہنا کر تحریر تو کیا جا سکتا ہے مگر اِس تحریر سے تحریک پیدا نہیں کی جا سکتی۔''۵۳

ان کے افسانوں میں تقریر وعظ کا انداز پایا جاتا ہے جو پڑھنے والے کو نصیحت کرتا ہے اُنہیں حقیقت سے روشناس کراتا ہے۔ وہ اپنے احساسات وخیالات کو دوسروں تک پہنچانے کا ہنر بخوبی جانتے ہیں بلاشبہ یہ مفید خدمت انھوں نے انجام دی۔ عادل سعید قریشی لکھتے ہیں:

''ساجد خان کے افسانوں میں ان کا خطیبانہ انداز بھی ان کے افسانوں کو عام ڈگر سے الگ کرتا دکھائی دیتا ہے۔ خطابت کی وجہ سے ان کے افسانے بلند آہنگ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں بڑی سہولت سے خطیب کا بھیس بدل کر آجاتے ہیں اور وعظ ونصیحت کر کے پھر کہانی کو تنہا چھوڑ جاتے ہیں۔ یوں کہانی کو ہائی جیک کرنا اور اپنے خطاب سے قاری کو مستفیض کرنے کے متعلق دو مکاتب فکر موجود ہیں ایک وہ جو کہانی میں یوں آجانے کو مذموم تصور کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو کہتے ہیں کہ اعلیٰ ادب اعلیٰ معاشرے اور مستحسن اقدار کو فروغ دیتا ہے۔'' ۵۴

کسی بھی مصنف کی تخلیق کا بڑا راز یہ ہے کہ وہ جو کچھ لکھتا ہے اس کا اثر انسان کے دل ودماغ پر کتنا پڑا ہے اور اس کے جذبات نے کیسا اثر کیا ہے۔ ساجد خان نے اپنے افسانوں میں زندگی کو موضوع بنایا اور وہی کچھ تحریر کیا جو اس نے محسوس کیا جو بھی واقعہ ہو کردار ہو انھوں نے اپنے گردوپیش سے لے کر نہایت عمدگی کے ساتھ افسانے میں پیش کیا۔ وہ پڑھنے والوں کو متاثر کرنے کی خوبی رکھتے ہیں اور ان پر وہی جذبات اور کیفیات طاری کر دیتے ہیں جو خود مصنف نے اپنے اندر محسوس کیں۔ اس ضمن میں عادل سعید قریشی یوں رقمطراز ہیں:

''ساجد خان کا اُسلوب لسانی وسائل کے منجھے ہوئے استعمال کے ساتھ ساتھ ادب کی جمالیاتی قدروں اور معاشرتی وثقافتی اقدار کا حامل ہے۔ ساجد خان کے افسانے اسی کے معاشرے اور اسی کے گاؤں کے کرداروں کی کہانیاں ہیں۔'' ۵۵

جنھیں ساجد خان نے اپنے اُسلوب سے دلچسپی اور دلآویزی سے ہمکنار کیا ہے۔

منتہا:

کوئی بھی افسانہ نگار پلاٹ کی تشکیل میں کہانی کے آغاز اور انجام میں ایک کشمکش پیدا کرتا ہے جس سے اس کہانی میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے کسی بھی کہانی کا آغاز قاری کو کسی پریشانی اور تذبذب میں مبتلا کر دیتا ہے کہ آخر اس کا انجام کیا ہوگا اور قاری اس کے ساتھ آخر تک جڑا رہتا ہے اچھے پلاٹ میں کہانی کا اختتام ایک خاص حیثیت رکھتا ہے، جس سے پڑھنے والے کے ذہن میں عجیب خیالات آتے رہتے ہیں وہ خود سے اس کا انجام نکالتا ہے لیکن تخلیق کار اپنی فنی مہارت سے اپنی کہانی کا انجام خوشی، غمی یا سبق آموز واقعہ پر کرتا ہے اور یہی کشمکش و تذبذب قاری کو اپنے ساتھ جوڑے رکھتا ہے۔سیّد وقار عظیم لکھتے ہیں:

> ''ہر اچھے اور سوچے ہوئے پلاٹ میں منتہا کا ہونا لازمی ہے۔کہانی ایک دھیمی اور نرم رفتار سے ایک سیدھے راستے پر چلتے چلتے یک بارگی اپنی انتہائی بلندی پر پہنچ جاتی ہے اس بلندی پر پہنچ کر پڑھنے والا تھوڑی بہت دیر کے لیے ایک اضطراب میں مبتلا ہوتا ہے اور اس کے بعد ہی فوراً کہانی تیزی سے خاتمہ تک پہنچ جاتی ہے۔افسانہ کی اسی بلند سیڑھی کو منتہا کہتے ہیں'' ۵۶

ساجد خان نے اپنے افسانوں کو بڑے احسن طریقے سے انجام تک پہنچایا ہے جس سے اُن کا مقصد بھی پورا ہو جاتا ہے اور قاری پر اپنا تاثر بھی چھوڑتا ہے۔اس ضمن میں رفیع الدین ہاشمی یوں رقمطراز ہیں:

> ''ایک اچھے افسانے میں منتہا ضروری ہوتا ہے کیونکہ صحیح قسم کے منتہا کی غیر موجودگی سے قاری پر افسانے کا کوئی تاثر قائم نہیں ہوتا منتہا کے بغیر افسانہ ایک بیانیہ مضمون ہو گا۔'' ۵۷

غرض ساجد خان نے اپنے افسانوں میں ماحول، معاشرہ اور تہذیب کی عکاسی کرداروں کے ذریعے کی ہے وہ اپنے منفرد اُسلوب سے کہانی تخلیق کرتے ہیں ان کی کہانی اسی معاشرے کی کہانی ہے۔جو درپیش اُلجھنوں کا بخوبی جائزہ لیتے ہیں اور غور و فکر سے اسے تحریری شکل میں لاتے ہیں کیوں کہ وہ معاشرے میں ہونے والی برائیوں اور مسائل کو جاننے کا شعور رکھتے ہیں اور وہی لکھتے ہیں جو اپنے ارد گرد دیکھتے ہیں۔ان کے افسانوں کے بارے میں پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیان صفی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''افسانے کے تین چار بنیادی لوازمات ہوتے ہیں جن میں کہانی، کردار، تہذیب اور روایت سے ہم آہنگی اور اسلوبِ بیان شامل ہے ۔ساجد خان کے افسانوں میں یہ لوازمات بدرجہ اتم موجود ہیں ۔دوسرے اہم بات اس کی کہانیوں میں ہزارہ اور بالخصوص حویلیاں کے مضافات کی تہذیب و معاشرے کے تمام عکس جھلملاتے ہیں ۔ اس نے اپنی کہانیوں کے کرداروں کے مسائل اپنے گردوپیش سے ہی اخذ کیے ہیں اس سرزمین اور گردوپیش کے مسائل کا شعور اور ادراک بھی کسی اچھے لکھاری کی پہچان ہوتا ہے ۔ساجد خان نے بلا شبہ اپنی روایت ،تہذیب اور ماحول سے کہانیاں کشید کی ہیں۔''۵۸

مصنف افسانوں میں افسانوں میں بے شمار بکھرے مسائل اور انسانی خیالات و حالات اور ان کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں اور لوگوں کے شعور کا جگانے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں ۔وہ معاشرے میں ایک عام فرد کی حیثیت سے عوام الناس کے دُکھ کو اپنا دُکھ سمجھتے ہیں انھوں نے فلسفیانہ ذہن سے کہانی تحریر کی ہیں انھیں مختلف مسائل نے اپنے حصار میں لیے رکھا ہے ۔وہ افسانوں کے ذریعے ان کی سوچ کو قلم کے ذریعے بہتر بنانے کی کوشش کرتے ہیں کیوں کہ ساجد خان ہر شے کو واقع کی گہرائی میں اتر کر اس کی اصلیت اُجاگر کرتے ہیں ۔ان کے افسانوں کے بارے میں محمد بشیر رانجھا یوں رقمطراز ہیں:

''ساجد خان کے افسانوں کی فنی خوبی یہ ہے کہ وہ سلجھے ہوئے ذہن کے ساتھ غور وفکر کا عادی ہے ۔معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں نے اسے حساس بنا دیا ہے اور وہ غلاظتوں کی نشاندہی کرنے پر قادر ہے ساجد خان تہذیبی، معاشرتی اور اخلاقی اقدار کا گہرا شعور رکھتا ہے ۔اُس کا ذہن فلسفیانہ ہے اور وہ انسانی کمزوریوں کا ادراک بھی رکھتا ہے ۔وہ مسائل کا فلسفیانہ تجزیہ کرتا ہے جو اس کی فن کاری کا مثبت اور روشن پہلو ہے ۔اس کے ہاں الفاظ کے بہاؤ اور خیالات کی روانی میں تیزی و تندی ہے وہ جذبات کی رو میں بہت دُور تک نکل جاتا ہے جو اس کی فنِ افسانہ پر دسترس کا واضح ثبوت ہے۔''۵۹

انھوں نے افسانے لکھ کر عوام الناس کو سمجھانے کی کوشش کی ہے ہر طرف دھوکا دہی، ظلم و ستم، قتل و غارت کا بازار گرم ہے کچھ لوگ ایسے ہیں جنھیں کھانے کو روٹی میسر نہیں اور کچھ نے فضول خرچی کو روز کا معمول بنایا ہوا ہے

سارے دنیا داری میں غرق ہیں آخرت کی کسی کو کوئی پرواہ نہیں۔بس انہی موضوعات پر انھوں نے افسانے تخلیق کیے ہیں۔میاں محمد اعظم ان کے افسانوں کے متعلق پنجابی کلام میں یوں کہتے ہیں:

''ساجد خاں نے لکھ افسانے نوں سمجھایا اے
ملک ساڈے وچ رولا رہندا خلقت شور مچایا اے

بم دھماکے، قتل و غارت نالے دہشت گردی اے
ایہ معمول ہویا نیں ایتھے روز پئی خلقت مردی اے

ہوندی پئی کرپشن ایتھے نالے رشوت خوری اے
شہراں دے وچ ڈاکے پیندے، پنڈاں دے وچ چوری اے

کوئی پئے لوکی عیش کریندے، کوئی پئے دکھ اٹھاندے نیں
کوئی کاراں تے سیر کریندے کوئی پئے ٹردے جاندے نیں

پڑھے لکھے پئے دھکے کھاندے جہڑے غربت مارے نیں
ہر تھاں چلے پیسہ رشوت اوہ تاں تھکے ہارے نیں

نہیں خدا دا خوف اونہاں نوں جہڑے ظلم کماندے نیں
ایہ وطیرہ بنیا اونہاں ذرا شرم نہیں کھاندے نیں''۶۰

ساجد خان نے اپنے افسانوں کا بڑے عمدہ اسلوب سے آغاز کرتے ہیں انھوں نے موجودہ حالات واقعات کو موضوع بنایا ہے اور معاشرے کی برائیوں کو بہت خوبصورتی سے اُجاگر کیا ہے اور سچ سب کے سامنے لا کر معاشرے کا اصل چہرہ دکھایا ہے۔جن کا ظاہر کچھ ہے اور باطن کچھ۔وہ جملوں میں بڑا مقصد بیان کر جاتے ہیں اور اس فن پر انھیں بھرپور دسترس حاصل ہے۔ان کے افسانوں کے بارے میں میاں محمد اعظم اپنے کلام میں مزید کہتے ہیں:

"کدھرے ساجد خاں پیا یارو عشق دی گل سناندا اے
چسکے لے کے شروع کریندا ، پچھوں پردے پاؤندا اے

حال گھڑی دیاں لکھ کے گلاں اوہنے سچ سنایا اے
جو کچھ ہوریا ہے اجکل ، شیشہ سب وکھایا اے

گل چھوٹی تے مطلب وڈا ، اوہدی اہ کہانی اے
طور طریقے نال ایہ سارے لوکاں نوں سمجھانی اے"[۱۶]

المختصر انھوں نے ادبی دنیا میں ہزارہ کی سرزمین میں رہتے ہوئے بہترین افسانے تحریر کیے جو معاشرتی زندگی کی خوب تر عکاسی کرتے ہیں۔ سادگی، سلاست اور سنجیدگی کی سچی تصویریں ان کے افسانوں میں ملتی ہیں انھوں نے کرداروں کے ذریعے افسانوں میں دلچسپی پیدا کی ہے اچھے کردار اور بُرے کردار ان کے افسانوں کو مکالمہ کے ذریعے عمدہ بناتے ہیں جو قاری کے لیے باعث مسرت ثابت ہوتے ہیں۔ انھوں نے فنکارانہ صلاحیت سے کہانی میں اختصار کے ساتھ اور مقصد کے بیان میں بے جا طوالت سے پرہیز کیا ہے ان کا ذہن فلسفیانہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کا انداز خطیبانہ ہے جو لوگوں کو نصیحت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور عوام الناس کو سچ کہنے اور انصاف حاصل کرنے کا شعور بیدار کرتے ہیں۔ بلاشبہ وہ سلجھے ہوئے ذہن سے افسانوں میں نئے ایسے الفاظ اور جملوں کو استعمال کرتے ہیں جو سنتے ہی دل میں اُتر جاتے ہیں اور افسانوی ماحول کو برقرار رکھتے ہیں اس کی بنیادی وجہ ان کا منفرد اُسلوب ہے وہ سادگی اور سلاست سے اپنا مقصد بیان کرتے ہیں وہ افسانوں میں زندگی کے مسائل سے پردہ اُٹھاتے ہیں وہ کہانی لکھنے کے فن کو جانتے ہیں ان کی کہانی کا آغاز قاری کو اپنا ہم نوا بنا لیتا ہے اس میں کسی قسم کی بوریت محسوس نہیں کرتا اور قاری افسانے آخر تک تجسس میں مبتلا رہتا ہے اور ساجد خان میں بہ حیثیت افسانہ نگار یہ خاصیت موجود ہے وہ لوگوں کو درپیش مسائل سے آگاہ بل کہ ان سے چھٹکارے کا حل بھی بتاتے ہیں۔ ان کا شمار بھی انہی تخلیق کاروں میں ہوتا ہے جو ناکامی کے باوجود ہمت نہیں ہارتے اور مسلسل جدوجہد کی طرف گامزن رہتے ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء،ص ۱۳۷

۲۔ساجد خان، مجھے روشنی چاہیے، فرینڈز پبلشرز، راولپنڈی، ۲۰۱۱ء،ص ۱۴

۳۔محمد بشیر رانجھا، ساجد خان فکر و فن، سلطان پبلشرز، راولپنڈی، ۲۰۱۹ء،ص ۲۳

۴۔ایضاً،ص ۲۶

۵۔رفیع الدین ہاشمی، اصناف ادب، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء،ص ۱۳۱

۶۔وقار عظیم، سیّد، فن افسانہ نگاری، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء،ص ۴۶

۷۔انٹرویو، عادل سعید قریشی، ایبٹ آباد پبلک سکول، ۲۲ اپریل ۲۰۲۱ء، بوقت 12 بجے دن

۸۔وقار عظیم، سیّد، فن افسانہ نگاری،ص ۵۶

۹۔ساجد خان، دائرے کا اسیر، سلطان پبلشرز، راولپنڈی، ۲۰۱۴ء،ص ۱۲

۱۰۔ایضاً،ص ۱۲

۱۱۔ایضاً،ص ۱۲

۱۲۔ایضاً،ص ۱۲

۱۳۔ایضاً،ص ۲۸

۱۴۔وقار عظیم، سیّد، فن افسانہ نگاری،ص ۱۳۷

۱۵۔محمد بشیر رانجھا، ساجد خان فکر و فن،ص ۶۵

۱۶۔ایضاً،ص ۵۸

۱۷۔ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات،ص ۱۸۶

۱۸۔ایضاً،ص ۱۸۶

۱۹۔ساجد خان، دائرے کا اسیر،ص ۱۵

۲۰۔ایضاً،ص ۱۵

۲۱۔ایضاً،ص ۱۵

۲۲۔ایضاً،ص ۲۶

۲۳۔ساجد خان، دائرے کا اسیر،ص ۲۶

۲۴۔ایضاً،ص۲۶

۲۵۔ایضاً،ص۲۶

۲۶۔محمد بشیر رانجھا،ساجد خان فکر وفن،ص۵۶

۲۷۔ابوالاعجاز حفیظ صدیقی،کشاف تنقیدی اصطلاحات،ص۱۳۵

۲۸۔ساجد خان،دائرے کا اسیر،ص۱۶

۲۹۔ایضاً،ص۵۶

۳۰۔ایضاً،ص۶۰

۳۱۔ایضاً،ص۹۲

۳۲۔ایضاً،ص۹۲

۳۳۔محمد بشیر رانجھا،ساجد خان فکر وفن،ص۶۹

۳۴۔انور جمال،پروفیسر،ادبی اصطلاحات،نیشنل بک فاؤنڈیشن،اسلام آباد،۲۰۱۹ء،ص۱۳۸

۳۵۔ابوالاعجاز حفیظ صدیقی،کشاف تنقیدی اصطلاحات،ص۱۳۵

۳۶۔ایضاً،ص۱۳۵

۳۷۔ساجد خان،دائرے کا اسیر،ص۵۷

۳۸۔ایضاً،ص۱۰۳،۱۰۴

۳۹۔ابوالاعجاز حفیظ صدیقی،کشاف تنقیدی اصطلاحات،ص۱۳۵،۱۳۶

۴۰۔انور جمال،ادبی اصطلاحات،نیشنل بک فاؤنڈیشن،اسلام آباد،س۔ن،ص۱۰،۱۱

۴۱۔ابوالاعجاز حفیظ صدیقی،کشاف تنقیدی اصطلاحات،ص۲۰۹

۴۲۔وقار عظیم،سیّد،فن افسانہ نگاری،ص۵۹

۴۳۔ابوالاعجاز حفیظ صدیقی،کشاف تنقیدی اصطلاحات،ص۲۰۹

۴۴۔وقار عظیم،سیّد،فن افسانہ نگاری،ص۶۰

۴۵۔ابوالاعجاز حفیظ صدیقی،کشاف تنقیدی اصطلاحات،ص۱۳

۴۶۔شعر وسخن،شمارہ۲۷،اکتوبر تا دسمبر،۲۰۱۷ء،ص۴۶

۴۷۔ساجد خان،مجھے روشنی چاہیے،ص۱۶

۴۸۔ساجد خان، دائرے کا اسیر،ص۲۴

۴۹۔ایضاً،ص۲۴

۵۰۔شعروسخن،شمارہ۲۷،ص۴۶

۵۱۔ایضاً،ص۴۶

۵۲۔ساجد خان، دائرے کا اسیر،ص۴۲

۵۳۔ایضاً،ص۶۲

۵۴۔شعروسخن،شمارہ۲۷،ص۴۶

۵۵۔ایضاً،ص۴۷

۵۶۔وقار عظیم،سیّد،فن افسانہ نگاری،ص۴۷

۵۷۔رفیع الدین ہاشمی،اصناف ادب،ص۱۳۰

۵۸۔محمد بشیر رانجھا،ساجد خان فکروفن،ص۳۲

۵۹۔ساجد خان، دائرے کا اسیر،ص۱۳۰

۶۰۔محمد بشیر رانجھا،ساجد خان فکروفن،ص۳۲

۶۱۔ایضاً،ص۳۳

بابِ پنجم: حاصل تحقیق

اُردُو ادب میں صنفِ افسانہ نگاری کو بہت اہمیت حاصل ہے افسانے کا موضوع زندگی ہے، جو اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ افسانہ سے پہلے قصے کہانیوں کا رواج موجود تھا، جو سُنی اور سنائی جاتی تھیں جیسے جیسے وقت گزرتا گیا تو کہانی کے پُرانے انداز کو نئے انداز میں لکھنا شروع کیا اس میں مختلف تجربات کیے گئے۔ چونکہ زمانہ مصروف ہو چکا تھا تو ان کے پاس لطف اخذ کرنے کے لیے وقت نہ رہا تو ان کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے افسانہ آگے بڑھا۔ جو طوالت سے پاک اور زندگی کا عکاس ہے افسانہ حقیقی زندگی کی تصویر کو اُجاگر کرتا ہے اور کسی ایک پہلو یا واقعہ کو سامنے لاتا ہے اس کے فن میں بیک وقت رومان، حقیقت اور اختصار یکجا ہے اور یہی اختصار افسانے کے حُسن کو بڑھاتا ہے اس کی اہم خوبی وحدت تاثر ہے جس میں طوالت سے گریز کر کے صرف اور صرف ایک ہی مقصد کو بروئے کار لایا جاتا ہے اگر ایک سے زیادہ مقاصد ہوں گے تو اس میں فنی خرابی پیدا ہوگی اور ایسا افسانہ غیر دلچسپ ہوگا۔ کیوں کہ افسانہ زندگی کے کسی ایک واقعہ، ایک پہلو کو بیان کرتا ہے اور قاری کے ذہن پر ایک تاثر چھوڑتا ہے۔

جہاں تک افسانے کے ارتقا کا تعلق ہے تو اُردُو کے ابتدائی افسانہ نگاروں میں سجاد حیدر یلدرم، منشی پریم چند، سلطان حیدر جوش، نیاز فتح پوری، غلام عباس، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، علی عباس حسینی، مجنوں گورکھ پوری، احمد ندیم قاسمی وغیرہ ہیں جنھوں نے اپنی فکر اور فن سے اُردُو افسانے کو بلندیوں تک پہنچایا اِن کے افسانوں میں معاشرے کی عکاسی بھرپور انداز میں کی گئی ہے، جس سے معاشرے کے حالات و واقعات سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔

بیسویں صدی کا عرصہ اُردُو کا سنہری دور تھا جس میں کمال کی حدوں کو چھونے والے فنکار پیدا ہوئے، جس سے نہ صرف شاعری بل کہ نثری ادب بھی اپنی قسمت پر ناز کرنے لگا اور اُردُو ادب میں صنفِ افسانہ نگاری کو بڑی تیزی سے مقبولیت حاصل ہوئی۔ اِسی طرح دیگر حلقوں کے شانہ بشانہ سرزمین ہزارہ میں بھی اس صنفِ ادب نے خوب ترقی کی منازل طے کیں۔ جس طرح ہر خطے اور ہر علاقے کے لوگوں نے اُردُو ادب کے لیے اپنا خونِ جگر پیش کیا ان میں ہزارہ کی سرزمین کسی سے کم نہیں کیوں کہ یہاں پیدا ہونے والے فنکاروں نے ادب سے خوب نبھائی، اور گیسوئے ادب سنوارے۔

سرزمین ہزارہ میں نصیرالدین نصیر پہلے افسانہ نگار مانے جاتے ہیں اُن کے افسانے ۱۹۱۴ء کے بعد سامنے آنا شروع ہوئے جو کہ اُردُو افسانے کا ابتدائی دور تھا ان کے علاوہ قتیل شفائی جو گیت نگار (شاعر) ہونے کے ساتھ ساتھ افسانہ نگار بھی تھے مزید یہ سلسلہ چلتا ہوا عبدالقیوم شفق ہزاروی، پروین سیف، فیاض عزیز، جانِ عالم، راجا محمد ریاض الرحمٰن، دل نواز عارفؔ، عادل سعید قریشی اور پھر ساجد خان تک پہنچتا ہے۔

ساجد خان کا تعلق حویلیاں سے ہے، جو ہزارہ کے نامور افسانہ نگاروں میں شامل ہوتے ہیں ان کے افسانے

معاشرتی زندگی کی خوب تر عکاسی کرتے ہیں۔سادگی،سلاست اور سنجیدگی کی سچی تصویر ان کے افسانوں میں ملتی ہیں۔ ان کے دو افسانوی مجموعے ''مجھے روشنی چاہیے'' اور ''دائرے کا اسیر'' منظر عام پر آ چکے ہیں ان کے افسانوں نے ملک بھر کے اہلِ قلم کی توجہ حاصل کی ہے اور ان سے داد و تحسین سمیٹی ہے۔ بالخصوص ''دائرے کا اسیر'' اپنے اندر فکری و فنی صلاحیتوں سے بھر پور افسانے سموئے ہوئے ہے۔

ساجد خان نے اپنے افسانے ''بے بسی، بے چارگی، در ماندگی'' میں یہ بات بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہم جو زندگی گزار رہے ہیں یہ فانی ہے اصل کی تلاش کرنی ہے۔آج کل لوگ آخرت کو بھول چکے ہیں اور گناہ پر گناہ کیے جا رہے ہیں۔افسانہ ''مکافاتِ عمل'' میں اس مقصد پر زور دیا ہے کہ کسی کے ساتھ بھی چاہے وہ بڑا ہے یا چھوٹا، مرد ہے یا عورت، جوان ہے یا بوڑھا کسی کو بھی ذلیل وخوار اور رسوا نہیں کرنا چاہیے کسی کے ساتھ ناانصافی یا کسی کو بلا وجہ پریشان نہیں کرنا چاہیے۔ کیوں کہ آپ جو آج کریں گے کل وہ تمھارے ساتھ بھی ہوگا لہٰذا ہر کسی کے سے اچھے اخلاق سے پیش آئیں۔ساجد خان نے بھی یہی بتایا ہے کہ آج کل ہمارے معاشرے میں بہت سے ایسے واقعات رونما ہو رہے ہیں اور انسان بہت سے مسائل سے دوچار ہے۔اگر کوئی بھی اخلاق سے بات کرے گا تو اسے معاشرے میں اعلیٰ مقام ملے گا۔اسی طرح افسانہ ''زمین سکڑ رہی ہے'' میں انھوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کیسے بڑے وڈیرے معصوم لوگوں کی زمینوں پر قبضہ کرتے ہیں،انہیں ڈراتے دھمکاتے ہیں یہاں تک کہ ان کے بچوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیتے ہیں۔ ایک زمین کے ٹکڑے کے لیے ہم کہاں سے کہاں جا رہے ہیں کوئی پتا نہیں بہر حال انھوں نے اپنے افسانے میں اس کو بیان کیا ہے اور قاری اس سے آگاہ ہے۔افسانہ ''سراغ'' انتہائی مختصر افسانہ ہے اور اس مقصد پر زور دیا گیا ہے کہ ہمیں خود کی تلاش کرنی چاہیے، اپنے آپ کو پہچاننا چاہیے کہ ہم کیا کرتے ہیں۔ بلا وجہ دوسروں پر اُنگلی اُٹھاتے ہیں اپنے گریبان میں نہیں جھانکتے اور دوسروں پر مسلسل نکتہ چینی کرتے ہیں اور اپنی اصلاح نہیں کرتے یہی بات افسانہ ''سراغ'' میں بتائی گئی ہے کہ ظاہر کے بجائے باطن کو بہتر بنانے کی کوشش کی جائے۔ہم کیا کرتے ہیں صاف ستھرا لباس زیب تن کر لیتے ہیں اور دل میں نفرت لیے بیٹھے ہیں اصل چیز باطن ہے جس کو بہتر کرنا ہے۔دعا یہ کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ظاہر و باطن کو سنت مطابق بنا دے اقبالؒ بھی اپنے من میں ڈوب کر سراغِ زندگی پانے کا مشورہ دیتے ہیں:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

ساجد خان افسانہ ''وی'' میں اس مقصد پر زور دیا ہے کہ بچوں کو گندی سیاست سے دور رہنا چاہیے وہ اپنی

پڑھائی کریں اور بلاوجہ کسی کے ہاتھوں استعمال نہ ہوں۔اس افسانے کو یاسر صدیقی کے ذریعے بیان کیا ہے اور مصنف کا مقصد شروع سے آخر تک یہی تھا کہ سیاست سے دور رہنا چاہیے، اپنے والدین کا کہا ماننا چاہیے، جس طرح یاسر صدیقی نے اپنے والد کی بات نہیں مانی اور سیاسی لوگوں نے اُسے استعمال کیا اور اُسے موت کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ افسانہ ''خلش''میں انھوں نے یہ بتایا ہے کہ اس دنیا میں خوشی اور غم دونوں ساتھ ہیں ہر کوئی کسی نہ کسی مسئلہ میں پھنسا ہوا ہے اور ہر کسی کو اپنا غم، اپنی پریشانی بہت بڑی لگتی ہے حالانکہ لوگ اس سے بُرے حالات میں پھنسے ہوئے ہیں یہ دنیا ہے یہاں دُکھ، درد، خوشی، غم ساتھ ساتھ چلتے ہیں ہم لوگوں کے دُکھ، درد کو نہیں دیکھتے صرف اپنے ہی مسئلہ کو بڑا سمجھتے ہیں۔لیکن اگر اپنے دائیں بائیں دیکھا جائے سینکڑوں ایسے ہیں جو مختلف اور بڑے مسائل سے دوچار ہیں۔ساجد خان کے افسانوں میں سے ہر افسانہ کسی نہ کسی مقصد کی تکمیل کرتا ہے۔

ساجد خان نے اپنے ماحول سے افسانے تخلیق کیے اور قارئین کو حقیقت سے آگاہ کیا۔جن میں فلسفیانہ سوچ و فکر کے ساتھ انسانی کمزوریوں کو پرکھا گیا ہے معاشرتی، معاشی و جذباتی، نفسیاتی، سیاسی اور سماجی مسائل پر فلسفیانہ تجزیہ کیا گیا ہے۔اِسی طرح خیالات میں روانی کے ساتھ شدت کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔افسانوں میں باطن کا سفر اور صوفیانہ آہنگ جا بجا ملتا ہے افسانے فطرت کے قریب اور فطرتی رنگ سمیٹنے کے ساتھ ساتھ جذبات نگاری، منظر نگاری، کردار نگاری سے بھی بھرپور ہیں۔ساجد خان چونکہ حساس طبیعت شخص ہیں اور یہی چیز ان کے افسانوں پر چھائی ہوتی ہے وہ معاشرے میں رہنے والے لوگوں کے دُکھ، درد کو اپنا درد سمجھتے ہیں اور جو بھی تحریر کرتے ہیں اس سے ان کا فن نکھر کر سامنے آتا ہے۔انھوں نے اپنے افسانوں کے پلاٹ میں نہایت چابکدستی سے کام کیا اور ایسے کردار پیش کیے جو ہمارے معاشرے کی جیتی جاگتی تصویر ہے اور ساتھ ہی ایسے مناظر دکھائے ہیں جو قاری کو اپنے ساتھ جوڑے رکھتے ہیں اور اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں وحدتِ تاثر کا عنصر بھی نمایاں ہے۔جو قاری پر اپنا تاثر چھوڑتا ہے ان کے افسانے سے اقوال بھی نکالے جا سکتے ہیں جملے اپنے اندر مکمل معنویت رکھتے ہیں جن کو افسانے سے ہٹ کر یا افسانے سے نکال کر بھی پیش کیا جا سکتا ہے افسانے میں استعمال ہونے والے الفاظ ذومعنی ہونے کے ساتھ استعارہ اور تشبیہات بھی سمیٹے ہوئے ہیں۔

میں نے اپنے تحقیقی مقالے میں ان کے فکر و فن کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے ساجد خان بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں انھوں نے اپنے تخیّل سے افسانے لکھ کر اُردو ادب کے ذخیرہ میں اضافی کیا۔بحیثیت افسانہ نگار یہ بھی دوسرے افسانہ نگاروں کی طرح ایک الگ مقام اور حیثیت رکھتے ہیں۔اور ہزارہ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اب بھی ایسے لکھاری موجود ہیں جو دوسروں کے دُکھوں کو اپنا دُکھ سمجھتے ہوئے ان کو پیش کر کے حل بھی بتاتے

ہیں۔

نصیرالدین نصیؔر پہلے افسانہ نگار ہیں اس لیے میں یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ بی ایس، ایم فل یا پی ایچ ڈی کی سطح پر تحقیقی کام کیا جائے تا کہ اُن کا کام مدون ہوکر منظرِ عام پر آسکے۔ ہزارہ میں افسانے لکھنے والوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے اس لیے میری تجویز یہ ہے کہ جس طرح میں نے ساجد خان کی افسانہ نگاری پر کام کیا ہے اس طرح دیگر افسانہ نگاروں پر مختلف سکالر سے کام کروایا جائے ،جس سے نہ صرف اُن لکھنے والوں کی قدر دانی اور حوصلہ افزائی ہوگی بل کہ اُن کے کام سے عوام وخواص بھی آشنا ہوسکیں گے۔اس کے علاوہ ہزارہ کی سطح پر لکھنے والے جتنے افسانہ نگار ہیں اُن سب کے افسانوں کو یکجا کر کے ایک کتابی صورت میں شائع کیا جائے تا کہ میری طرح بعد میں آنے والے سکالرز کو اپنی تحقیق اور اصل منابع تک پہنچنے میں سہولت ہو۔ نیز قارئین بھی ہزارہ کے افسانہ نگاروں کی نگارشات سے بہ سہولت مستفید ہوسکیں۔

تحقیق میں کوئی بات حرفِ آخر نہیں ہوتی، میں یہ نہیں کہتا کہ ساجد خان پہ میں نے جو کام بھی کیا ہے وہ حرفِ آخر ہے اُن پر مختلف زاویۂ نظر سے مزید کام ہوسکتا ہے۔ تاہم میں نے جو کام کیا ہے وہ بعد میں آنے والے محقق کے لیے سنگِ میل کا کام دے گا اور فنِ افسانہ نگاری میں ہزارہ، کے پی کے اور پاکستان کی سطح پر اُن کا مقام ومرتبہ متعین کرنے میں معاون ثابت ہوگا۔

کتابیات

بنیادی ماخذ:

ا۔ساجد خان، دائرے کا اسیر، سلطان پبلشرز، راولپنڈی،۲۰۱۴ء

۲۔ساجد خان، مجھے روشنی چاہیے، فرینڈز پبلشرز، راولپنڈی،۲۰۱۱ء

ثانوی ماخذ:

ا۔ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد،۱۹۸۵ء

۲۔ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، اُردُو کی ادبی تحریک کا خاکہ، اُردُو اکیڈمی سندھ، کراچی،۱۹۶۹ء

۳۔ارشد محمود ناشاد، ڈاکٹر، اصنافِ ادب: تعارف وتفہیم، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد،۲۰۱۲ء

۴۔اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر، ترقی پسند اُردُو افسانہ اور چند اہم افسانہ نگار، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی،۲۰۰۲ء

۵۔الملک عبداللہ بن عبدالعزیز آل مسعود، القرآن کریم مع اُردُو ترجمہ وتفسیر، س۔ن

۶۔انور سدید، ڈاکٹر، اُردُو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اُردُو، پاکستان،۲۰۱۳ء

۷۔انور سدید، ڈاکٹر، اُردُو افسانے میں علامت نگاری، دیر پبلشرز، کراچی، س۔ن

۸۔انور جمال، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد،۲۰۱۹ء

۹۔انوار احمد، ڈاکٹر، اُردُو افسانہ ایک صدی کا قصہ، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، س۔ن

۱۰۔بشیر احمد سوز، پروفیسر، ہزارہ میں اُردُو زبان وادب کی تاریخ، ادبیات ہزارہ، (مرکز تحقیق واشاعت)،۲۰۱۰ء

۱۱۔بشیر احمد سوز، پروفیسر ہزارہ میں اُردُو افسانے کی روایت، ادبیات ہزارہ، (مرکز تحقیق واشاعت)،۲۰۱۰ء

۱۲۔بشیر احمد سوز، پروفیسر، مصنفین ہزارہ، ادبیات ہزارہ، (مرکز تحقیق واشاعت)،۲۰۱۰ء

۱۳۔پروین اظہر، ڈاکٹر، اُردُو میں افسانہ نگاری کی تنقید، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ،۲۰۰۰ء

۱۴۔حامد بیگ، مرزا، افسانہ کی روایت، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد،۲۰۰۱ء

۱۵۔خالد علوی، ڈاکٹر، انگارے کا تاریخی پس منظر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی،۱۹۹۵ء

۱۶۔خلیل الرحمٰن اعظمی، اُردُو میں ترقی پسند ادبی تحریک، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، س۔ن

۱۷۔راج نرائن راز، خواجہ احمد عباس افکار، گفتار، کردار، ہریانہ اُردُو اکادمی،۱۹۸۹ء

۱۸۔رفیع الدین ہاشمی، اصنافِ ادب، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور،۲۰۱۸ء

۱۹۔سلیم اختر، ڈاکٹر، افسانہ اور افسانہ نگار (تنقیدی مطالعہ)، لاہور،۱۹۹۱ء

۲۰۔سلیم اختر،ڈاکٹر،اُردُو ادب کی مختصر تاریخ،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۲ء
۲۱۔سلیم اختر،ڈاکٹر،تنقیدی اصطلاحات،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،س۔ن
۲۲۔سلیم اختر،ڈاکٹر،افسانہ حقیقت سے علامت تک،مکتبہ عالیہ،لاہور،۱۹۷۶ء
۲۳۔شاعر علی شاعر،نیا اُردُو افسانہ،سٹی بُک پوائنٹ،کراچی،۲۰۱۱ء
۲۴۔عابد علی عابد،اصول انتقادِ ادبیات،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۶ء
۲۵۔عبادت بریلوی،تنقیدی زاویے،اُردُو افسانے پر ایک نظر،اُردُو اکادمی سندھ،کراچی،۱۹۶۹ء
۲۶۔عبدالقادر سروری،دنیائے افسانہ،مکتبہ ابراہیمیہ،حیدرآباد،س۔ن
۲۷۔علامہ اقبال،کلیات اقبال،نیشنل بُک فاؤنڈیشن،اسلام آباد،۲۰۱۸ء
۲۹۔فرزانہ شاہین،اُردُو کے نمائندہ افسانہ نگار،ڈائمنڈ آرٹ پریس،۲۰۰۹ء
۳۰۔فرمان فتح پوری،ڈاکٹر،اُردُو افسانہ اور افسانہ نگار،الوقار پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۳ء
۳۱۔فرمان فتح پوری،ڈاکٹر،اُردُو فکشن کی مختصر تاریخ،بیکن بُکس،لاہور،۲۰۱۳ء
۳۲۔فردوس انور قاضی،ڈاکٹر،اُردُو افسانہ نگار کے رجحانات،مکتبہ عالیہ،لاہور،۱۹۹۰ء
۳۳۔فوزیہ اسلم،ڈاکٹر،اُردُو افسانے میں اُسلوب اور تکنیک کے تجربات،یورپ اکادمی،اسلام آباد،۲۰۱۰ء
۳۳۔کشور ناہید،خواتین افسانہ نگار،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۴ء
۳۴۔گوپی چند نارنگ،پروفیسر،اُردُو افسانے کی روایت اور مسائل،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۱۹۸۶ء
۳۵۔گوہر رحمان نوید،صوبہ سرحد میں اُردُو ادب،یونیورسٹی پبلشرز،پشاور،۲۰۱۰ء
۳۶۔قمر رئیس،ڈاکٹر،اُردُو افسانے میں انگارے کی روایت:تنقیدی تناظر،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی،۱۹۷۸ء
۳۷۔قمر رئیس،ڈاکٹر،ترقی پسند ادب کے پچاس سال،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی،س۔ن
۳۸۔محمد عالم خان،اُردُو افسانے میں رومانی رجحانات،فراز کمپوزنگ سنٹر،لاہور،س۔ن
۳۹۔محمد بشیر رانجھا،ساجد خان:فکر و فن،سلطان پبلشرز،راولپنڈی،۲۰۱۹ء
۴۰۔محمد صادق،ڈاکٹر،اُردُو افسانہ،اُردُو مجلس،دہلی،۱۹۸۱ء
۴۱۔منصف خان سحاب،تاریخ ہزارہ،مکتبہ جمال،لاہور،۲۰۱۴ء
۴۲۔وزیر آغا،ڈاکٹر،بیسویں صدی کی ادبی تحریکیں،نئے تناظر،لاہور،۱۹۸۱ء
۴۳۔وزیر آغا،ڈاکٹر،اُردُو فکشن (تنقید)،الحمد پبلی کیشنز،لاہور،۱۹۸۱ء

۴۴۔وقار عظیم،سیّد، داستان سے افسانے تک، الوقار پبلی کیشنز، لاہور،۲۰۱۴

۴۵۔وقار عظیم،سیّد،فنِ افسانہ نگاری، الوقار پبلیشرز، لاہور،۲۰۱۴

۴۶۔وقار عظیم،سیّد، نیا افسانہ، مطبوعہ جناح پریس، دہلی، س۔ن

رسائل و جرائد:

ا۔روزنامہ،K2 ٹائمز ایبٹ آباد، بدھ ۳۰ اکتوبر ۲۰۱۳ء

۲۔سہ ماہی، شعر و سخن، مانسہرہ، شمارہ ۲۷، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۷ء

انٹرویوز:

ا۔انٹرویو، ملک عرفان، رہائش گاہ حویلیاں، ۱۸اپریل ۲۰۲۱ء، بوقت 12 بجے دن

۲۔انٹرویو، غلام مرتضیٰ، گورنمنٹ ماڈل ہائی سکول حویلیاں، ۱۳اپریل ۲۰۲۱ء، بوقت 2 بجے دن

۳۔انٹرویو، عبدالرحمٰن جاوید، گورنمنٹ ماڈل ہائی سکول حویلیاں، ۱۵اپریل ۲۰۲۱ء، بوقت 1 بجے دن

۴۔انٹرویو، ملک شاہد اعوان، گورنمنٹ ماڈل ہائی سکول حویلیاں، ۱۵اپریل ۲۰۲۱ء، بوقت 2 بجے دن

۵۔انٹرویو، مفتی حفیظ الرحمٰن طاہر، گورنمنٹ ماڈل ہائی سکول حویلیاں، ۱۵اپریل ۲۰۲۱ء، بوقت 1 بجے دن

۶۔انٹرویو، عادل سعید قریشی، ایبٹ آباد پبلک سکول، ۲۲اپریل ۲۰۲۱ء، بوقت 12 بجے دن

۷۔انٹرویو، کرنل سید مقبول حسین، دفتر اکادمی ہزارہ حویلیاں، ۲۶اپریل ۲۰۲۱ء، بوقت ا بجے دن

۸۔انٹرویو، نعیم عرف پپو، رہائش گاہ حویلیاں گاؤں، ۱۵اپریل ۲۰۲۱ء، بوقت 11 بجے دن

۹۔انٹرویو، تنویر الٰہی، رہائش گاہ حویلیاں گاؤں، ۱۸اپریل ۲۰۲۱ء، بوقت 12 بجے دن

۱۰۔نٹرویو، محمد زاہد قریشی، رہائش گاہ حویلیاں گاؤں، ۱۸اپریل ۲۰۲۱ء، بوقت 1:30 بجے دن

انگریزی ماخذات:۔

1.Edger Allan Poe's thesis that stories must have
coumpact,nified,United effect